Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1983

اس پرچہ میں

(۱) نظریہ ضرورت

(۲) عورت کا مقام

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۳۶/- روپے غیر ممالک ۸۶/- "	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۶	اپریل ۱۹۸۳ء	شمارہ ۴

فہرست

۱۔ لمعات (سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری) . . ۲

۲۔ عورت کا مقام (عورتوں کو کمتر سمجھنا ذلیلِ انسانیت ہے) . . ۱۱

۳۔ "جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں" ۲۵

(بتقریب یوم پاکستان) — محترم پرویز صاحب

۴۔ نظریۂ ضرورت کے عملی نتائج ۴۹

۵۔ اسلام کیا ہے؟ (تازہ ایڈیشن) ۶۱

۶۔ قرآنی درس کے اعلانات ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس، ۹، ایبک روڈ، لاہور

باسمہ تعالےٰ

لمعات

اگر خاموش بنشینم گناہ است

طلوعِ اسلام کی (پاکستان میں) پینتیس سالہ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اس نے کبھی عملی سیاسیات میں حصّہ نہیں لیا۔ کوئی حکومت آئے کوئی جائے، اسے اس سے سروکار نہیں ہوتا جس حکومت کی طرف سے کوئی اچھا کام ہو یہ اس کی تائید اور تعریف کرتا ہے جس سے کوئی نقصان رساں عمل سرزد ہو، یہ اس کی مخالفت کرتا اور قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔ جس اقدام سے اس خطّہ زمین کو ضعف پہنچتا ہو وہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ نقصان رساں اور سنگین خطرات کا موجب ہوتا ہے اسلئے یہ اس کی بحدِ امکان بھرپور مخالفت کرتا ہے۔

دوسری حقیقت جس پر طلوعِ اسلام کی تاریخ گواہ ہے، یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی مذہبی فرقہ سے نہیں۔ نہ ہی اس نے اپنا کوئی الگ فرقہ بنایا ہے۔ ارکانِ اسلام کی ادائیگی اسی طرح کرتا ہے اور کرنے کی تلقین کرتا ہے جس طرح باقی مسلمان کرتے ہیں ختمِ نبوت کو یہ اسلام کی انفرادیت کی اصل و بنیاد قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کو یہ آخری اور مکمل ضابطہ حیات، اور دین (اسلام) میں آخری سند و حجت، اور جائز و ناجائز، حق و باطل، کفر و ایمان کا معیار قرار دیتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ (اسوۂ حسنہ) کو شرف و عظمت انسانیت کے ماپنے کا پیمانہ سمجھتا ہے۔

یہی وہ اقدار، معیار اور پیمانے ہیں جن کی رو سے وہ اپنی (امتِ مسلمہ کی) تاریخ کو ماپتا اور پرکھتا ہے۔ اس میں جو بات، جو فیصلہ، جو واقعہ ان پیمانوں پہ پورا اترتا ہے اسے وہ اسلامی تسلیم کرتا ہے جو ان کے مطابق نہ ہو اُسے خلافِ اسلام قرار دیتا ہے خواہ تاریخ اسے کسی کی طرف بھی منسوب کیوں نہ کرے۔ یہ اس لئے کہ ہماری تاریخ صحیح اور غلط، رطب اور یابس، کذب و صداقت، حقیقی اور وضعی کا ملغوبہ ہے۔ اس کی تطہیر کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ اسے قرآن مجید کی کسوٹی پہ پرکھ کر دیکھ لیا جائے جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔

ہمارے مروجہ اسلام کی سند یہی تاریخ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کیفیت ہماری تاریخ کی ہے وہی مروجہ اسلام کی ہے۔ یہ بھی حقیقی اسلام اور وضعی اسلام کا ملغوبہ ہے۔ اور (امت کی بدقسمتی کہ) وضعی اسلام، حقیقی

اسلام پر اس درجہ غالب آچکا ہے کہ اس کی (حقیقی اسلام کی) جھلک تک نظر نہیں آتی۔ پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں حقیقی اسلام کو (بارِ دگیر) نافذ کیا جا سکے۔ لیکن (وائے بر حالِ ما کہ) اس میں نہ صرف یہ کہ کامیابی نہیں ہوئی بلکہ اس پر پہلے سے پڑے ہوئے پردے اور زیادہ دبیز ہو گئے ہیں۔

طلوع اسلام قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہے اور اس کی ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔ اس سے زیادہ نہ اس کا کوئی دعوےٰ ہے، نہ مقام۔ لیکن قرآن کے طالب علم کی پوزیشن دیگر علوم کے طلبا، متجسّسین اور محققین سے مختلف ہوتی ہے۔ دیگر علوم کے طلبا کو جو علم حاصل ہو، یہ ان کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے کہ اسے اپنی ذات تک محدود رکھیں یا دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ لیکن قرآن کے طالب علم پر از روئے قرآن یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے قرآن سے سمجھا ہے اُسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ قرآن کی رو سے کتمانِ حق، تلبیسِ حق و باطل سے کم سنگین جرم نہیں۔ اس بنا پر قرآن کا اس سے مطالبہ ہوتا ہے کہ ــــ دیکھا ہے جو کچھ تو نے، اوروں کو بھی دکھلا دے ــــ طلوع اسلام اپنی استطاعت اور امکان کے مطابق اس فریضہ کو بھی ادا کئے چلا آ رہا ہے، اور اس کی پاداش میں، ہر گوشے سے ہدفِ تیر و سناں بن رہا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ یہ اگر قرآنی حقائق کو عام کرتا ہے تو اس سے نہ کسی کی مخالفت مقصود ہوتی ہے، نہ کسی کی دل آزاری مطلوب۔ اس سے مقصد اپنے فریضہ کی ادائیگی ہوتا ہے جس کے لئے یہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ قرآنی حقائق کا انکشاف و اظہار اگر کسی پر گراں گذرتا ہے تو اس میں طلوع اسلام کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ کسی کی پسندیدگی کی خاطر اپنے فریضہ کو ترک کر سکتا یا مداہنت برت سکتا ہے۔ اگر طلوعِ آفتاب سے چشمِ خفاش میں خیرگی پیدا ہوتی ہے اور اس کی روشنی اس پر ناگوار گذرتی ہے، تو اس کی خاطر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سورج افق سے ابھرے نہیں! مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند۔ لازم و ملزوم ہیں۔ اسی کا نام . . . کشمکشِ حق و باطل ہے، جو ایک ابدی حقیقت ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبالؒ)

اپنے اسی فریضہ کی ادائیگی کے ضمن میں ہم اس (نہایت تلخ) داستان کو مختصر الفاظ میں پھر دہرانے پر مجبور ہیں، جسے ہم سالہا سال سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی "تاریخ کی یہ داستان کہ حقیقی اسلام کیا تھا اور وہ مروجہ اسلام میں کس طرح بدل گیا۔ اور پھر یہ کہ کیا حقیقی اسلام کا احیا، ممکن بھی ہے۔ اور اگر ممکن ہے تو اس کا طریق کیا ہو گا۔ ہم پھر عرض کر دیں کہ ہم جو کچھ کہیں گے وہ تاریخ کا معروضی مطالعہ (OBJECTIVE - STUDY) ہے۔ اس سے نہ کسی فرقہ کی مخالفت مقصود ہے، نہ بحث و جدل مطلوب ہے۔ آگے ہم مختصر مسلمات کی شکل میں پیش کریں گے۔ متعلقہ آیات کے بھی (زیادہ تر) حوالوں پر اکتفا کیا جائے گا:۔

(۱) دین خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے جسے وہ رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچاتا ہے (۹/۳۳)۔ اسی لئے اس نے "دین اللہ" کہا ہے (۳/۸۳)۔ دین کو کسی رسول کی طرف منسوب نہیں کیا۔

(۲) اسی من جانب اللہ دین کو الاسلام کہا گیا ہے (۳/۱۹)۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی دین قابل قبول

نہیں۔ ([illegible])

(۳) خدا اپنے رسولوں کو جو دیتا ہے (یعنی دیتا تھا) اسے اس کی وحی کہا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کی طرف قرآن وحی کیا گیا (۶/۱۹)

(۴) رسول اللہ خود بھی اس قرآن پر ایمان لائے تھے۔ (۲/۲۸۵)، (۴۲/۵۲)

(۵) حضورؐ پر اسی قرآن کو فرض قرار دیا گیا تھا۔ (۲۸/۸۵)۔ اور اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا تھا (۴۳/۴۳)، (۶/۱۰۶)، (۷/۳) اور آپؐ اسی کا اتباع کرتے تھے (۱۰/۱۵)، (۶/۵۰)، ([illegible])۔

(۶) دین کے معاملہ میں قرآن کافی تھا (۲۹/۵۱)

(۷) یہ مکمل بھی تھا اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶)۔ خود رسول اللہؐ بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ (۱۰/۱۵)

(۸) حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ جملہ امور کے فیصلے اسی قرآن کی رو سے کیا کریں (۵/۴۸)؛ (۴/۱۰۵)۔

(۹) رسول اللہؐ کے بعد حضورؐ کی امت کو اسی کتاب کا وارث بنایا گیا (۳۵/۳۲)

(۱۰) ان سے کہا گیا کہ جو اس قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے وہ کافر ہوں گے (۵/۴۴)۔ وہ ظالم ہوں گے (۵/۴۵)۔ فاسق ہوں گے (۵/۴۷)۔

(۱۱) اگر کسی معاملہ میں باہمی اختلاف ہو جائے تو اسی (قرآن) کی رو سے اسے رفع کرو۔ (۴۲/۱۰)۔ اس کے سوا کسی اور کو حکم (فیصلہ کرنے والا) تسلیم نہ کرو (۶/۱۱۴)۔

(۱۲) انہیں تاکید کر دی کہ تم اسی قرآن کے ساتھ تمسک رہنا اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کر لینا (۳/۱۰۲)۔ کیونکہ تفرقہ پیدا کر لینا (فرقوں میں بٹ جانا) شرک ہے (۳۰/۳۲)۔ اگر تم فرقوں میں بٹ گئے تو نہ تمہارا خدا سے کوئی تعلق رہے گا، نہ خدا کے رسولؐ سے کوئی واسطہ (۶/۱۶۰)۔ اس سے تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے (۳/۱۰۵)۔

(۱۳) یاد رکھو! دین قرآن میں مکمل ہو گیا ہے (۵/۳)۔ جو اس میں نہیں وہ دین میں نہیں (۴۲/۲۱)۔ اس کی خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ قرآن کا ہر لفظ فیصلہ کن حقیقت ہے۔ مذاق نہیں (۸۶/۱۴)۔

(۱۴) اس کے احکام اور اصولوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے طریق کار، باہمی مشورہ سے وضع کیا کرو۔ اسی کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا (۳/۱۵۸)۔ یہی تمہارا طرزِ عمل ہونا چاہیئے (۴۲/۳۸)۔

(۱۵) اس طرزِ حکومت اور نظامِ زندگی کا نام استخلاف فی الارض ہوگا (۲۴/۵۵)۔ اس کا مقصد الدین کو متمکن کرنا ہوگا۔ اس میں حکمرانی صرف خدا کی ہوگی (۱۲/۴۰؛ ۱۸/۲۶؛ ۶/۵۷)۔ اس میں کسی انسان کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ یہ حق رسولؐ کو بھی حاصل نہیں تھا (۳/۷۸)۔ خدا کی حکومت کا عملی طریق اس کی کتاب کی حکمرانی ہوگا (۵/۴۴)۔

(۱۶) اس میں اتباع صرف کتاب اللہ کا ہوگا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی نہیں ہوگا (۹/۳۱-۳۳)

یہ تھا وہ (حقیقی) اسلام جو عہدِ نبی اکرمؐ میں بھی نافذ تھا اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کے زمانے میں

بھی۔ اس زمانے میں قرآن کے سوا اُمت کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی ـــ نہ روایات کے مجموعے ۔ نہ فقہ کی کتابیں ۔ اس میں تمام مسلمان ایک اُمت کے افراد تھے۔ ان میں نہ مختلف فرقے تھے نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔ ان کی ایک مملکت تھی جس میں سیاسی پارٹیوں کا بھی وجود نہ تھا۔ اس مملکت کا سربراہ، جس کا تقرر (ماسوا رسول اللہؐ) اُمت کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ یہی ان کی مرکزی اتھارٹی تھی۔ ان کا آئین اور ضابطۂ قوانین خدا کی کتاب تھی جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا تھا۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق تھی، نہ مختلف فقہ کی کتابیں۔ یہ تھا دینِ خداوندی کا عملی نقشہ ـــ اسی کو اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہا جاتا تھا۔

اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہ کوئی کسی کا محکوم تھا نہ محتاج۔ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی (رزق) مہیا کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے وسائل پیداوار مملکت کی تحویل میں رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں کوئی فرد راتد کو بھوکا نہیں سوتا تھا، اور سربراہِ مملکت بھی گیہوں کی روٹی اس وقت کھاتا تھا جب اسے یقین ہو جاتا کہ تمام افرادِ مملکت کو گیہوں کی روٹی میسر ہے، (ان کے ہاں گیہوں کی روٹی انتہائی "عیاشی" تھی۔ اَلْحَنْشُ کہتے ہی روٹی کو ہیں)۔ اس نظام میں تمام انسان (مرد۔ عورت سب) محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب التکریم تھے، اور تذلیلِ انسانیت سنگین ترین جرم تھا ـــ یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک گورنر نے کسی کو منافق کہہ دیا تو اسے اس سے معافی مانگنی پڑی کیونکہ اسے بھی اس شخص کی توہین و تحقیر تصور کیا گیا۔ اس میں آزادیٔ فکر و عمل کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ نبی اکرمؐ نے (جو سربراہِ مملکت بھی تھے) ایک لونڈی سے کچھ ارشاد فرمایا تو اس نے بغیر کسی جھجک کے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا حضورؐ کا ذاتی مشورہ۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ یہ آپؐ کا ذاتی مشورہ ہے تو اس نے بلا تامل کہہ دیا کہ پھر معاف فرمایئے۔ میں اپنے معاملات کو آپؐ سے بہتر سمجھتی ہوں۔ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف تھا نہ حزن۔ ہر ایک کو علم تھا کہ وہ کون سے احکام و ضوابط خداوندی ہیں جن کی پابندی اس پہ لازم ہے، اور یہ کہ وہ احکام و ضوابط غیر متبدل ہیں۔ اس سے اسے کامل امن و اطمینان حاصل تھا۔

اس قسم کا تھا وہ نظام جو قرآن کی رُو سے قائم ہوا تھا۔

یہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک "خلافت" قائم رہی۔ اس کے بعد جب امت پر ملوکیت مسلط ہو گئی تو اسلام کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ ملوکیت کے معنی ہوتے ہیں بزورِ شمشیر اقتدار پر قابو پا لینا۔ اس کے بعد یہ اقتدار (ذاتی جائیداد کی طرح) موروثی بھی ہو جاتا ہے۔ یہ نظام قرآن کے یکسر خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی بنیاد ہی خلافِ قرآن تھی تو اس میں قرآنی قوانین کے نفاذ کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ حصولِ اقتدار کا قرآنی طریق مملکت کے اسلامی ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ ملوکیت کو اسی لئے خلافِ اسلام کہا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار قرآنی طریق کے مطابق حاصل نہیں کیا جاتا۔

لیکن ان سلاطین کی مشکل یہ تھی کہ رعایا بہرحال مسلمان تھی جسے مطمئن رکھنا ضروری تھا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ سوچئے کہ یہ کس قدر مشکل مرحلہ تھا۔ لیکن انہوں نے اس مشکل کا حل دریافت کر لیا۔ (انہوں نے خود یہ حل تلاش کر لیا یا ان کے حاشیہ نشینوں نے انہیں یہ سمجھا دیا!) اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہؐ کو صرف قرآن نہیں ملا تھا۔ مثلہ معہ - قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ملا تھا۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ جنہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا تھا ان کے حوصلے کس قدر دراز، اور جرأتیں کس قدر بے باک تھیں! اللہ تعالیٰ نے باربار یہ چیلنج دیا ہے کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۲۳)۔ جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے اگر تمہیں اس کے منجانب اللہ ہونے پر شبہ ہو تو (پورا قرآن نہیں۔ اس کی) ایک سورۃ کے مثل بنا کر دکھاؤ۔ اس کے لئے جنہیں بھی تم اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہو، ملا لو۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲/۲۴)۔ اگر تم ایسا نہ کر سکے، اور ہم دعوے سے کہہ دیتے ہیں کہ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ قطعاً نہیں کر سکو گے۔ تو پھر جہنم کے عذاب سے ڈرو۔

کفار نے تو اس کی بہت سعی کی کہ قرآن کی کسی ایک سورۃ کی مثل بنا کر دکھا دیتے۔ لیکن خود ہم نے یہ دعوے کر دیا کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ہے اور قیاست بالائے قیامت کہ اسے منسوب کر دیا خود ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف۔ اس کے لئے نہ ہم خدا سے ڈرے نہ اس کے رسولؐ سے نادم ہوئے! اس عقیدہ کے وضع کرنے والوں پر جب یہ اعتراض کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رسول اللہؐ نے قرآن کی مثل اپنی طرف سے نہیں بنایا تھا۔ یہ بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا تھا یعنی وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی مکتوب تھی جو قرآن کے اندر درج اور محفوظ ہو گئی۔ دوسری وحی لکھی نہیں گئی تھی۔ روایات کے ذریعہ زبانی آگے چلی تھی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جس دن یہ عقیدہ وضع ہوا اسی دن اسلام دوسری پٹڑی پر جا پڑا۔ پھر حقیقی اور غیر ملوث و غیر محرف اسلام باقی نہ رہا۔ طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۸۱ء میں علامہ تمنا عمادیؒ کا ایک نہایت بلند پایہ تحقیقی مقالہ شائع ہوا تھا جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ یہ روایت یکسر وضعی ہے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ اس دوسری وحی کو نہ رسول اللہؐ نے منضبط کر کے امت کو دیا تھا نہ ہی خلافتِ راشدہ کے زمانے میں یہ ضبط تحریر میں آئی تھی۔ حتیٰ کہ جب (عباسیوں کے زمانے میں) یہ عقیدہ وضع ہوا، اس وقت بھی یہ کسی کتاب میں منضبط نہیں تھی۔ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ لوگ جن باتوں کے متعلق کہیں کہ وہ رسول اللہ کے ارشادات ہیں انہیں (اپنی زبانی) جمع کر لیا جائے۔ یہ سلسلہ رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد شروع ہوا۔ ان میں سے جن جامعین روایات کو معتبر اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے، انہیں کس قدر کثیر تعداد میں روایات ملیں اور انہوں نے ان میں سے کتنی روایات کو مسترد کر کے بقایا کو قابل قبول سمجھا اس کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے لگائیے:۔

نام جامع روایات	کسقدر روایات ملیں	ان میں سے کس قدر قابلِ قبول سمجھیں	نام جامع روایات	کتنی روایات ملیں	ان میں سے کس قدر قابلِ قبول سمجھیں
(۱) امام بخاریؒ	چھ لاکھ	(مکررات ملا کر) ۷۲۶۳	(۲) امام مسلمؒ	تین لاکھ	۴۳۴۸
(۳) امام ابو داؤدؒ	پانچ لاکھ	۴۸۰۰	(۴) امام ترمذیؒ	تین لاکھ	۴۱۱۵
(۵) امام ابن ماجہؒ	چار لاکھ	۴۰۰۰	(۶) امام نسائیؒ	دو لاکھ	۴۳۲۱

واضح رہے کہ (۱) یہ سنیوں کے مجموعے ہیں۔ شیعوں کے مجموعے ان سے الگ ہیں۔ اور (۲) یہ سنیوں کے بھی وہ مجموعے ہیں جنہیں یہ صحاح ستہ (یعنی احادیث کے چھ مجموعے) قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مجموعے ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس (ابتدائی زمانے) میں بھی کس قدر ایسی روایات پھیلی ہوئی تھیں جو (خود جامعین کے معیار کے مطابق) ناقابلِ قبول تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ جامعین نے ان میں سے اپنے قیاس کے مطابق فیصلہ کیا کہ کون کون سی روایت قابلِ قبول ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس سے یقینی طور پر معلوم کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے فی الواقعہ ایسا فرمایا تھا۔ یہ وجہ ہے جو ایک ہی مجموعہ میں متضاد احادیث بھی ملتی ہیں اور مختلف مجموعوں میں ایک دوسرے سے متضاد بھی۔

اور یہ ہیں وہ روایات جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے وحی خفی کے ذریعے حضورؐ کو ملی تھیں۔ اور ان کی حیثیت ہے ۔۔ قرآن کی مثل، قرآن کے ساتھ ۔۔ اتنا ہی نہیں کہ یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں، عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن پر اضافہ بھی کر سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اسے منسوخ بھی۔ اگر قرآن اور حدیث کے کسی حکم میں تضاد ہو تو حکم حدیث کا واجب الاطاعت ہوگا۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس ایک عقیدہ سے ان سلاطین کے احکام اور ان کی روش زندگی کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کتنے چور دروازے کھل گئے۔ جو بات سامنے آئی اس کے لئے ایک روایت وضع کر لی۔ ان وضعی احادیث کی کس قدر بھرمار تھی؟ اس کا اندازہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے اس تحقیقاتی مقالہ سے لگایئے جو طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۱ء میں "وضع حدیث" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ وضعی روایات کا ایک سیلاب تھا جو اُمنڈے چلا آ رہا تھا اور جن سے ہر خلافِ اسلام عقیدہ اور مسلک کے جواز کی سند مل جاتی تھی۔

جب مملکت کو قوانین کی ضرورت پڑی تو اس زمانے کے ماہرین قانون نے (جنہیں فقہا کہا جاتا ہے) قوانین مرتب کئے جو بیشتر انہی روایات پر مبنی یا ان سے مستنبط تھے۔ جس طرح روایات ایک دوسرے سے متضاد تھیں اسی طرح ان فقہا کے ضوابط قوانین بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس طرح اُمت فرقوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے کہا کہ ہم براہ راست روایات کو اسلام سمجھتے ہیں۔ انہیں اہلِ حدیث کہا جاتا ہے۔ اور ان کے بھی کئی فرقے ہیں۔ دوسروں نے کہا کہ ہم فقہ کو اسلام تسلیم کرتے ہیں۔ یہ تھے، چونکہ مختلف ائمہ فقہ کی مختلفات تھیں اس لئے ان میں مزید فرقے پیدا ہو گئے ۔۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی۔ شافعی وغیرہ (ان کے علاوہ بے شمار اور بھی) مملکت نے یہ کیا کہ امورِ مملکت اپنی تحویل میں رکھ لئے جن میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہیں تھا۔ اور پرسنل لاز ان مذہبی پیشواؤں کے حوالے کر دیئے کہ تم آپس میں لڑو جھگڑو۔ اس میں مملکت کا فائدہ تھا۔ ان کے باہمی جھگڑے کتنے ہی ہوں، قرآن کو سند اور حجت کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا تھا ۔۔۔ نہ مملکت، نہ مذہبی پیشوائیت۔ اصل یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)

قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لئے تو یہ سارا کھیل کھیلا گیا تھا (قرآن کو سند ماننے سے سب سے پہلے خود ملوکیت ختم ہو جاتی اور اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی۔ ان دونوں کا مفاد اس میں تھا کہ قرآن طاقوں پر رکھا رہے اور اس کا مصرف (اس کے لفظوں کی تلاوت) سے ثواب حاصل کرنا اور اسے مردوں کو پہنچانا رہ جائے۔ اس نہج سے دیکھئے تو ہم سابقہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) کے مقام پر ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے بھی قائل تھے لیکن اس کے ساتھ دوسری وحی (وحی غیر مکتوب) پر بھی ایمان رکھتے تھے[1]۔ یہ وحی روایات کی شکل میں تھی جس کا نام مِشنا تھا۔ انہی روایات کی رو سے انہوں نے اپنی فقہ مرتب کی جسے تالمود کہا جاتا ہے۔ اسے بھی وہ تورات کی مثل سمجھتے تھے۔ تورات پر ان کا محض رسمی ایمان ہے۔ عمل روایات اور فقہ ہی پر ہے۔ یہی مسلک ہمارا ہے۔

اسلام کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں خدا کی کتاب محفوظ تھی۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ کتاب اللہ کو محفوظ تو اس لئے رکھا گیا تھا کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر کتاب اللہ محض تلاوت کے لئے ہو اور عمل روایات اور فقہ کے مطابق، تو کتاب اللہ کا محفوظ (بلکہ موجود) ہونا یا نہ ہونا یکساں ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کا رویہ دیکھتے ہوئے سخت مواخذہ کیا تھا کہ تم انسانوں کے وضع کردہ احکام کو شریعت خداوندی قرار دیتے ہو اور لوگوں سے یہی کہہ کر ان کی اطاعت کراتے ہو اور اس باطل فروشی کو تم نے ذریعہ معاش بنا رکھا ہے (فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ... (2/79)

سوچئے کہ کیا ہم بعینہٖ اسی مقام پر نہیں؟ ہم نے کتاب اللہ کو بالائے طاق رکھ کر جامعین روایات کے قیاس کی رو سے منتخب کردہ احادیث کو ارشادات رسول اللہ قرار دیا۔ پھر انہیں قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) ٹھہرایا۔ پھر ان کی رو سے انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل شریعت خداوندی قرار دیا اور انہی کی اطاعت کا نام اسلام رکھا۔ یہ سب ملوکیت کا ساختہ پرداختہ تھا جس کا مقصد اپنی غیر اسلامی روش کو اسلامی بنا کر دکھانا تھا۔ ملوکیت کے ختم ہو جانے کے بعد ان اختراعات کو بھی ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن ان پر ابدیت کی مہر لگانے کے لئے تقلید اسلاف کو عین اسلام قرار دے دیا۔ اس سے رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ... (2/170)۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم اپنے اسلاف کے مسلک ہی کا اتباع کریں گے۔" وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ○ (39/45)۔ جب ان کے سامنے خدائے واحد، لاشریک (قرآن خالص) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کا دل پیچ و تاب کھانے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب خدا کے سوا اوروں کا ذکر کیا جائے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ اپنے معتقدین کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ لا تسمعوا لهذا القرآن۔ جہاں کہیں قرآن کی بات ہو تو اسے مت سنو۔ اور اس خیال سے کہ اسے دوسرے لوگ نہ سن لیں۔ والغوا فیہ۔ خوب شور مچاؤ۔ قرآن خالص کی طرف دعوت دینے والے

[1] ہم نے وحی کی دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں ہی سے مستعار لیا ہے۔

کے خلاف نہایت زور شور سے پراپیگنڈہ کرو ـــــ یہ منکرِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور تو دن کے روزوں کی تلقین کرتا ہے۔ اردو میں نماز پڑھتا ہے۔ ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کسی دن نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ و قس علیٰ ہذا۔ یہ جھوٹا پراپیگنڈہ مسلسل اور متواتر کئے جاؤ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (۲۶/۴۱)۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قرآن کی آواز کو دبا سکو گے۔

ان حالات میں آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ جہاں کیفیت یہ ہو وہاں وہ غیر ملوث اور غیر محرف حقیقی اسلام باریاب ہو سکتا ہے جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے؟ علامہ اقبالؒ کے دلِ حقیقت شناس اور نگہ بصیرت افروز نے اس کے امکان کی ایک تدبیر سوچی تھی۔ اور وہ یہ کہ کوئی ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جہاں پہلے سے کوئی حکومت قائم نہ ہو۔ وہاں مروجہ اسلام کی جگہ حقیقی اسلام نافذ کیا جائے۔ وہ خطۂ زمین تو حاصل ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ہزار سال تک ملوکیت کے تابع جن اجتماعی جرائم کا ارتکاب کیا تھا اس کی سزا کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی اس لئے جس مقصد کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ اس سے پہلے یہ اسلام، مذہبی پیشوائیت کے فتووں کی شکل میں تھا کہ جس کا جی چاہے انہیں مانے جس کا جی چاہے نہ مانے، لیکن اب ان فتووں نے مملکت کے قوانین کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن کے نہ ماننے سے سزا وارد ہو جاتی ہے۔ اس سے انہوں نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اگر (موجودہ حکومت کے بعد) کوئی اور حکومت چاہے یا کل کلاں کو موجودہ اربابِ اقتدار بھی چاہیں کہ انہیں منسوخ کر دیا جائے یا ان میں رد و بدل کر دیا جائے تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے کیونکہ ایسا کرنے کو ارتداد قرار دے دیا جائے گا اور (ان کے فتووں کی رُو سے) مرتد کی سزا قتل ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ کے اوراق پر خون کے چھینٹے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ اربابِ مذہب نے جس عقیدہ، نظریہ، مسلک یا عمل کو اپنے تصور کے اسلام کے خلاف قرار دیا، اس سے خونِ مسلم کی کس قدر ارزانی ہوئی۔ اس سلسلہ میں مودودی (مرحوم) پہلے سے لائحہ عمل تجویز کر کے دے گئے ہیں کہ۔

> جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دین کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے، بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح بھی بچائے نہ جا سکیں انہیں دل پہ پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (مرتد کی سزا۔ اسلامی قانون میں۔ پہلا ایڈیشن صفحہ ۸۰)

یہ ہے جو مروجہ اسلام نے ہمارے ساتھ کیا ہے، اور پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کرنے کے جرم کی پاداش میں جو کچھ

ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ اس سے نہ ہم دین کے رہے ہیں نہ دُنیا کے۔ دین کے اس لئے کہ اس اسلام میں قرآن کا کوئی دخل نہیں۔ اور دُنیا کے اس لئے کہ جہاں کسی نے کوئی بات علم و عقل کے مطابق کی کفر کے فتووں کی تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔

کسی غیر متوقع انقلاب کی الگ بات ہے، ورنہ بحالاتِ موجودہ، حقیقی اسلام کے احیاء کا امکان پاکستان تو کیا کسی مسلمان ملک میں بھی نظر نہیں آتا۔ ان ممالک میں بعض تو وہ ہیں جن کے اربابِ اقتدار مروجہ اسلام ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے ہاتھوں حقیقی اسلام کے احیاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض وہ ہیں جن کے اربابِ اقتدار تو ایسا نہیں سمجھتے لیکن چونکہ وہاں کے عوام پر اربابِ مذہب کا اثر غالب ہے اس لئے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کی جراٴت اپنے اندر نہیں پاتے۔

ان حالات حقیقی اسلام کے احیاء و تمکن کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ

(۱) مسلم ممالک میں سے کسی جگہ کوئی ایسا صاحبِ بصیرت و بسالت پیدا ہو جائے جو اپنی سیرت و کردار کی بلندی اور پاکیزگی کی بنا پر قوم کا محکم اعتماد حاصل کرے۔ صحیح خطوط پر قوم کی ذہنیت میں تغیر پیدا کرنے کا انتظام کرے اور مذہبی پیشوائیت کی فوغا آرائی اور ہنگامہ خیزی سے خوف نہ کھاتے ہوئے بتدریج حقیقی اسلام کو نافذ کرتا جائے۔ اور یا پھر

(۲) کوئی غیر مسلم قوم (اقوامِ مغرب کی طرح) اپنے موجودہ نظامِ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آ کر خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اس طرح حقیقی اسلام کا تصور اور نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ اس کے سوا حقیقی اسلام کے احیاء اور تمکن کی کوئی صورت ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔

جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے وہ (حسبِ سابق) حقیقی اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بہ ہمہ استطاعت و امکان، برابر ادا کرتا رہے گا۔ اسلئے کہ خود ہی فیصلہ کرکے، نا امید ہو کر بیٹھ جانے کی اجازت قرآن نہیں دیتا۔ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۴۰)۔ ایک ابدی ہدایت ہے۔ یعنی ہمارے ذمہ اس پیغام کا عام کئے جانا ہے۔ اس کا نتیجہ کب اور کہاں برآمد ہوگا اس کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ دینِ خداوندی کو غالب آ کر رہنا ہے (۹/۳۳)۔ یہ ایمان ہمیں مایوس نہیں ہونے دیتا۔

عورت کا مقام

(عورتوں کو کم تر سمجھنا تذلیلِ انسانیت ہے)

آج کل عورت (نہیں بلکہ اس کے مسئلہ) نے جو اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس سلسلہ میں ہمیں بکثرت استفسارات موصول ہو رہے ہیں جن کا ملخص یہ ہے:-

قرآن مجید نے عورت کا جو بلند مقام متعین کیا ہے اس کی وضاحت اس مقالہ سے بالخصوص ہوتی ہے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی۔ جون ۱۹۸۲ء میں ——— عورت قرآن کے آئینے میں ——— کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ قرآن کی اس واضح تعلیم و تصریح کے برعکس، مروجہ احکامِ شریعت کی رو سے عورت کا جو مقام سامنے آتا ہے اس سے تو وہ سطحِ انسانیت سے بھی گر جاتی ہے۔ "مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں"۔ یہ مروجہ شریعت کا مسلمہ فیصلہ ہے۔ اس سے اس کی حیثیت گھر کی نگرانی کی بھی نہیں رہتی۔ عورت (بیوی) گھر کے تمام کام کاج بھی کرتی ہے اور اس کے بعد مرد کی جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ جنسیات کے سلسلہ میں فقہ اور روایات کی رو سے جو مسائل بیان کئے جاتے ہیں انہیں سن کر تو نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ان سے تو (SEX – PERVERSION) نمایاں نظر آتی ہے۔

کیا آپ بتائیں گے کہ قرآن کی ماننے والی قوم میں یہ معکوس تبدیلی کب اور کیسے آئی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ عورت کو ایسی پست سطح پر کس طرح پہنچایا گیا۔

اس کے لئے آپ کو کچھ زیادہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے دورِ ملوکیت کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالئے۔ ساری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ طلوعِ اسلام بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں ہم نے اس تاریخ کا ایک باب شائع کیا تھا جس کا تعلق لونڈیوں سے تھا۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کے زمانے میں ساری دنیا میں بالعموم اور عرب میں بالخصوص، غلام اور لونڈیاں معاشرہ کا عام جزو بن چکے تھے۔ ان کا بنیادی سرچشمہ، جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدی ہوتے تھے۔ ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا کہ وہ انہیں اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔ اس کے بعد انہیں فروخت بھی کیا جا سکتا تھا۔ قرآن کریم نے بیک

حضرت غلامی کے اس دروازے کو یہ کہہ کر بند کر دیا کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ انہیں فدیہ لے کر اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو احساناً رہا کر دیا جائے گا۔ (۴۷/۴) آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر کے اس نے مختلف احکامات صادر کئے جن سے وہ غلام اور لونڈیاں جو اس وقت معاشرہ میں موجود تھے، یا تو رفتہ رفتہ رہا کر دیئے جائیں یا معاشرہ کا جزو بنا دیئے جائیں۔ قرآن میں مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جو احکام ملتے ہیں وہ اس زمانے کے انہی غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں۔

لیکن ملوکیت نے جہاں دیگر انسانیت سوز معائب اور مظالم کے دروازے کھولے وہاں غلاموں اور لونڈیوں کو بھی عام کر دیا۔ طلوع اسلام میں شائع شدہ جس مقالہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں آپ دیکھیں گے کہ اس زمانے میں سارا معاشرہ لونڈیوں سے پٹا پڑا تھا۔ کوئی گھر خالی نہ تھا جس میں لونڈی نہ ہو۔ نہ لونڈیوں کی تعداد پر کوئی پابندی تھی۔ نہ ان سے نکاح کی ضرورت۔ ان کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خلیفہ متوکل (عباسی) کے حرم میں چار ہزار متوعہ لونڈیاں تھیں۔ (متوعہ کے معنی ہیں وہ جن سے جنسی خواہش پوری کی جائے)۔ جب خلیفہ کے حرم میں لونڈیوں کی یہ بھرمار تھی تو اس سے امراء وزراء، رؤساء، حتٰی کہ مذہبی پیشواؤں کے گھروں میں ان کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لونڈیوں کی خرید و فروخت باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ کاروبار کرنے والوں کو نخاس کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مویشیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ بعد میں اس کے ساتھ لونڈیوں کی خرید و فروخت کا بزنس بھی شروع کر دیا۔ ان کی وجہ سے ان منڈیوں کو بھی نخاس کہا جاتا تھا جہاں یہ لونڈیاں بکا کرتی تھیں اس کاروبار پر نگاہ رکھنے کے لئے خود حکومت کی طرف سے انسپکٹر مقرر ہوتے تھے۔ نخاس یہ کاروبار کرتے تھے اور فقہا ان (لونڈیوں سے متعلق) "شرعی" احکامات وضع کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں جاری رہا۔

یہاں ایک ثانیہ کے لئے رکیئے۔ جب ہم "لونڈیاں" کہتے ہیں تو ہمارا ذہن عورت کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ "لونڈیوں" کے لفظ سے (عورتوں سے الگ) کسی اور جنس کا تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ لیکن لونڈیاں، عورتیں ہی تھیں۔ اسی قسم کی عورتیں جس طرح کی عورتیں ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بیویاں ہوتی ہیں۔ اب اس لفظی تبدیلی کے بعد اس منظر کو سامنے لایئے کہ بغداد (اور مملکت کے دوسرے شہروں میں) عورتیں بکا کرتی تھیں۔ جو چاہے انہیں خرید کر لے جائے۔ یہ گھروں میں (نوکرانیوں کی طرح) کام کاج بھی کرتی تھیں اور ان سے جنسی اختلاط بھی ہوتا تھا۔ نہ ان کی تعداد پر کوئی پابندی تھی نہ نکاح کی ضرورت۔ جب جی چاہے ان عورتوں کو فروخت بھی کر دیا جاتا تھا۔ ارباب شریعت (علماء اور فقہاء)

۱؎ حرم غلطی ملاحظہ فرمایئے۔ حرم مقدس مقام کو کہتے ہیں۔ جیسے حرم کعبہ۔ یہ سلاطین اپنے ان گھروں کو حرم کہتے تھے جن میں چار چار ہزار بے نکاحی عورتیں عیاشی کا سامان فراہم کرتی تھیں۔

نے یہ سب کچھ از روئے اسلام جائز قرار دے رکھا تھا۔

غور فرمائیے کہ جس قوم میں عورتوں کی یہ حالت ہو اس کے متعلق یہ سمجھنا کیا مشکل ہے کہ اس میں عورت کو اس قدر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے؟

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اس سارے کاروبار کو از روئے شریعت جائز اور حلال قرار دیا جاتا تھا۔ جس کے سینے میں قلبِ سلیم دھڑکتا ہو وہ اس مقام پر یقیناً پوچھے گا کہ قرآن مجید کی موجودگی میں اس کاروبار کو جائز کس طرح قرار دیا جا سکتا تھا! سوال یقیناً حیرت انگیز ہے لیکن اس کا جواب بڑا آسان۔ اس زمانے میں یہ خلافِ قرآن روش سے نئے ایک حدیث وضع کر لی جاتی تھی اور اس حدیث کی سند یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ نے اسے جائز قرار دیا تھا۔ ان ایام میں جعلی حدیثیں کس کثرت اور جرأت سے وضع کی جاتی تھیں۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں بکثرت لکھا جا چکا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب، مقامِ حدیث)۔ مثال کے طور پر ملا علی قاری (مرحوم) نے اپنی کتاب موضوعاتِ کبیر میں لکھا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ شیخ محمد طاہر گجراتی (تذکرۃ الموضوعات میں) لکھتے ہیں کہ جوئباری۔ ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجا کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب اسے قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کیں۔ جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا ہوں۔ آپ سوچئے کہ جعلی حدیثوں کے اس ٹکسال سے، عورتوں کی خرید و فروخت اور پھر عورت کے مقام کے متعلق (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کی اسناد حاصل کر لینا کون سا مشکل کام تھا؟ اس قسم کے احکام کہ

مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔

صاف بتا رہے ہیں کہ اس دور میں جب اس قسم کے احکام وضع ہوئے۔ تو ذہنوں میں تصور لونڈیوں کا تھا اور احکام عورتوں کے متعلق وضع ہو رہے تھے۔ یہ بات کہ مرد (یعنی اس کا آقا) لونڈی پر حاکم اور داروغہ ہوتا ہے واقعہ کے مطابق تھا۔ اس کا اطلاق تمام عورتوں پر کر دیا گیا۔ یا اس قسم کے احکام کہ

حضرت ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ اور مردوں کو عورتوں کو مارنے پیٹنے کا بھی حق حاصل ہے۔ اور یہ کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوا اللہ کے دوسروں کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ یا یہ کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ (بخاری) اور صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑ دے تو صبح تک اللہ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں[1]۔

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے۔ مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۱

ظاہر ہے کہ اس قسم کے احکام انہی عورتوں کے متعلق دیئے جا سکتے ہیں جنہیں (مال مویشی کی طرح) خرید کر لایا گیا ہو: یعنی لونڈیوں کے متعلق ۔ شرفِ انسانیت سے مزیّن کسی رفیقۂ حیات کے متعلق تو اس کا تصوّر تک کرتے سے بھی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں ۔ ان روایات کے وضعی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ احادیث کے اُن مجموعوں میں موجود ہیں جنہیں مستند اور صحیح ترین کہا جاتا ہے ۔ عورتوں کے متعلق فقہی قوانین اسی قسم کی روایات پر مبنی ہیں ۔

(۶)

اب آگے بڑھئے ۔ جس معاشرہ میں صورت یہ ہو کہ عورتیں سربازار بک رہی ہوں اور ہر مرد کو (شرعاً) اجازت ہو کہ وہ جتنی جی چاہے خرید لائے اور ان سے بلا نکاح جنسی اختلاط کرتا رہے، سوچئے کہ نفسیاتی طور پر ایسی قوم کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ جنسیات (SEXUALITY) میں ٹھوڑی ٹھوڑی تک ڈوبی ہوئی ہوگی اور عورت کی حیثیت اس کے نزدیک ایک جنس، (COMMODITY) سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی اور اس کا مقصد مرد کی جنسی خواہش کی تسکین کا سامان فراہم کرنا؟ وضعی روایات کی رو سے اس کے لئے نظائر بھی مہیا کر لئے گئے ۔ ہم نے جب بھی اس موضوع پر گفتگو کی، ان نظائر کے پیش کرنے کی ہمت نہیں پڑی ۔ لیکن اب سینے پر پتھر رکھ کر دو ایک مثالیں سامنے لانے کی جرأت کرنی ہی پڑی ۔ اس لئے کہ ان کے بغیر جنسیت کے متعلق ہماری قوم کی نفسیات سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔ اور جب تک یہ بات سمجھ میں نہ آئے، یہ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ ہمارے یہاں عورت کو اس قدر پست درجے پر کیوں رکھا جاتا ہے ۔ ان مثالوں کے حوالوں کے لئے نوٹ کر لیجئے ۔

(۱) صحیح بخاری ۔ اردو ترجمہ مرزا حیرت ۔ شائع کردہ نور محمد ۔ کارخانۂ تجارت کتب ۔ آرام باغ کراچی ۔ (تین جلدوں میں)

(۲) مشکوٰۃ ۔ مترجم کا نام نہیں لکھا ۔ (شائع کردہ ایضاً) ۔ دو جلدوں میں ۔

(۳) نہایت معتبر تفسیر ابن کثیر ۔ اردو ترجمہ (مولانا) محمد (مرحوم) ۔ شائع کردہ اخبار محمدی ۔ باڑہ ہندو راؤ ۔ دہلی ۔ (تین جلدوں میں) ۔

اب ملاحظہ فرمایئے چند ایک مثالیں ۔ انہیں پڑھئے اور اشکِ ندامت سے اپنا دامن تر کرتے جایئے

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ انہوں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ سلیمان بن داؤد (پیغمبر علیہما السلام) نے ایک روز کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا ۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شہسوار پیدا کریں گی، جو خدا کی راہ میں جہاد کریں گے ۔ تو ان کے ایک ہم نشین نے کہا کہ انشاء اللہ کہو ۔ مگر انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا ۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی، سو وہ بھی آدھا بچہ جنی ۔ قسم ہے اس خدا کی جس

کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر وہ انشاء اللہ کہہ دیتے تو سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور بے شک وہ سب سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (بخاری۔ جلد دوم۔ صفحہ۔ کتاب الجہاد)۔ خود ذاتِ رسالت مآبؐ سے متعلق ہے۔ (ابیز صفحہ ۱۷۱)

(۲) انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبیؐ اپنی تمام بی بیوں کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے۔ اور وہ گیارہ تھیں۔ قتادہؓ کہتے ہیں۔ میں نے انسؓ سے کہا کہ کیا آپ ان سب کی قوت رکھتے تھے۔ وہ بولے کہ ہاں۔ بلکہ ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی تھی۔
(بخاری۔ جلد اول۔ صفحہ ۔ و صفحہ ۔ باب الغسل)۔

(۳) جنت بلند ترین مقام ہے جو مومنین کو عطا کیا جائے گا اور وہاں کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ جنت کے مردوں کی قوتِ رجولیت کے متعلق:۔

(حضرت) انسؓ کہتے ہیں۔ نبیؐ نے فرمایا ہے۔ جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی۔ (یعنی مثلاً دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت) پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ! کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ فرمایا۔ جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔
(مشکوٰۃ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۹)

یہ تو رہا مردوں کی قوتِ مجامعت کے متعلق۔ اب جنت کی عورتوں کے متعلق بھی سن لیجئے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

(۴) حضرت ابوطیبہؒ فرماتے ہیں۔ جنتیوں کے سروں پہ ابر آئے گا۔ ... میں ندا ہوگی کہ کس چیز کا برسنا چاہتے ہو؟ پس جو لوگ جس چیز کا برسانا چاہیں گے ... وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی۔ یہاں تک کہ کہیں گے۔ ہم پر اُبھرے ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی۔ (ابن کثیر۔ چھبیسواں پارہ۔ صفحہ ۱۱)

ان عورتوں کا جزئیاتی تجزیہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک ایک جنتی کی بہتر بہتر بیویاں ہوں گی۔ ان میں سے ہر ایک ستر جوڑے پہنے ہوئے ہوگی۔ جو سب باریک اور سبز چمکیلے خاص ریشم کے ہوں گے۔ یہ بیوی اس قدر نازک اور نورانی ہوگی کہ اس کی کمر پہ ہاتھ رکھ کر سینے کی طرف سے دیکھے گا۔ تو صاف نظر آ جائے گا۔ یہ اس کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہوگا۔ نہ یہ تھکے، نہ وہ، نہ اس کا دل بھرے نہ اس کا۔ جب کبھی نزدیکی کرے گا تو کنواری پائے گا۔ نہ اس کا عضو سست ہو نہ اسے گراں گزرے۔ مگر خاص پانی وہاں نہ ہوگا جس سے گھن آئے۔ یہ یونہی مشغول ہوگا۔ جو کان میں ندا آئے گی کہ یہ تو ہمیں خوب معلوم ہے کہ نہ آپ کا دل ان سے بھرے گا نہ ان کا آپ سے۔ مگر آپ کی دوسری بیویاں بھی ہیں۔ اب یہ یہاں سے باہر آئے گا اور ایک ایک کے پاس

جائے گا۔ جس کے پاس جائے گا بے ساختہ اس کے منہ سے نکل جائے گا کہ رب کی قسم، تجھ سے بہتر جنت میں کوئی چیز نہیں۔ میری محبت کسی سے تجھ سے زیادہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ! کیا جنت میں جنتی لوگ جماع بھی کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں! قسم ہے اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ خوب اچھی طرح۔ بہترین طریق پر۔ جب الگ ہوگا۔ وہ اس وقت پھر پاک صاف اچھوتی باکرہ بن جائے گی۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔ مومن کو جنت میں اتنی اتنی عورتوں کے پاس جانے کی قوت عطا کی جائے گی۔ حضرت انسؓ نے پوچھا۔ حضورؐ! کیا اتنی طاقت رکھے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ایک سو آدمیوں کے برابر اسے قوت ملے گی۔ طبرانی کی حدیث میں ہے۔ ایک ایک سو کنواریوں کے پاس ایک ایک دن میں ہو آئے گا۔ (ابن کثیر پارہ ستائیس ص ۲۹۳)

کرنے کو تو اس قسم کی اور تفاصیل بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے یہی مثالیں کافی ہیں۔ آپ سوچئے کہ جس زمانے میں (وضعی احادیث اور تفاسیر کا ایسا "مقدس") لٹریچر مرتب ہوتا تھا اس میں لوگوں کی جنسی ذہنیت کی کیفیت کیا ہوگی اور ان کے نزدیک عورت کا مصرف کیا؟ علم النفس (سائیکالوجی) میں اس کے لئے جنسی آوارگی یا بدنہادی SEX-PERVERSION کی اصطلاح آتی ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس (PERVERSION) کی بھی کچھ مثالیں پیش کر دیں لیکن اس کے لئے ہمت نہیں پڑتی (بالخصوص اس لئے کہ طلوع اسلام ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، کی نظروں سے بھی گذرتا ہے اور ہم ان مثالوں سے ان کی پاکیزہ نگاہوں کو آلودہ نہیں کرنا چاہتے)۔ جو احباب یہ معلوم کرنا چاہیں وہ فقہ کی کتابوں (مثل ہدایہ، درمختار، عالمگیری وغیرہ) میں غسل، وضو، روزہ وغیرہ سے متعلق ابواب دیکھ لیں۔ اس کی کچھ مثالیں مطالب الفرقان میں بھی مل جائیں گی۔ مثلاً جلد سوم (ص ۲۷۶ تا ۲۷۹) میں وطی فی الدبر (یعنی مقعد میں مجامعت) کی تفصیلی بحث میں بتایا گیا ہے کہ امام مالکؒ جیسے جید محدث اور فقہ کے چار جلیل القدر ائمہ میں سے ایک امام، اس پر عمل بھی کرتے تھے اور بڑے فخر سے اس کا اعتراف اور اعلان بھی فرماتے تھے۔

حدیث، تفسیر اور فقہ کی یہی کتابیں ہیں جو ہمارے دار العلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں اور جن کی تکمیل کے بعد طالب علم، عالم بن جانے کی سند حاصل کر لیتا ہے۔ علاوہ اس امر کے کہ ان سے ان کی نظروں میں عورت کا کیا مقام متعین ہوتا ہے یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ یہ کتابیں ان طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں جو جوان بھی ہوتے ہیں اور (بالعموم) غیر شادی شدہ بھی۔ انسان کے خیالات کا جنسی خواہش کے اشتعال پر کس قدر شدید اثر پڑتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کتابوں میں اس قسم کے "مسائل" پڑھنے سے ان طالب علموں کی ذہنیت اور نفسیات جس قدر متاثر ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے!

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہو کہ یہ غلامی اور اس سے پیدا ہونے والے جنسی مسائل ہمارے عہد ملوکیت تک محدود رہے ہوں گے۔ ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ اب بھی ہماری شریعت کے یہی مسائل ہیں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) انہیں ہمارے مذہبی مدارس و مکاتب میں علوم شریعت کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ اور ہمارے موجودہ مفسر بھی انہی کو دہراتے رہتے ہیں۔ (مثلاً) ہمارے زمانے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ وہ روشن خیال۔ لبرل قسم کے عالم تھے۔ آپ دیکھئے کہ وہ غلامی کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ وہ اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں، جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

> حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (ان عورتوں کو) رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں
> (جلد اول۔ صفحہ ۳۴۰ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

انہوں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب "تفہیمات" حصہ دوم میں بڑی شرح و بسط سے کی ہے۔ وہ ان عورتوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی ضرورت نہیں (صفحہ ۳۱۰)۔ نیز ان کی تعداد کی بھی کوئی حد نہیں (صفحہ ۳۲۴ و صفحہ ۳۱۹)۔ جہاں تک ان کی خرید و فروخت کا تعلق ہے وہ لکھتے ہیں:-

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کو منتقل کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۳)

اللہ تعالیٰ نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا تھا کہ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴) "انہیں رہا کرنا ہوگا۔ خواہ فدیہ لے کر اور خواہ احسان کے طور پر" اور اس کے ساتھ ہی اپنے احکامات کے متعلق کہا تھا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۶/۱۱۶) خدا کے احکام مکمل بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ لیکن مودودی (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ خدا کے احکام (معاذ اللہ) مکمل نہیں۔ خدا نے صرف دو صورتیں بتائی ہیں۔ فدیہ یا احساناً۔ لیکن یہ حکم نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل اس طرح ہوتی ہے کہ قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بطور احسان رہا بھی کیا جا سکتا ہے اور انہیں غلام اور لونڈیاں بھی بنایا جا سکتا۔ احکام خداوندی مکمل اس طرح ہوتے ہیں! (معاذ اللہ! صد بار معاذ اللہ)

لونڈیوں کے فروخت کرنے کے سلسلہ میں یہ احتمال تھا کہ اگر وہ حاملہ ہو جائے تو اس کی قیمت کم رہ جائے گی۔ اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ

> حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔

چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) آپ عزل[1] کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا۔ کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ .... تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا ہونا اللہ تعالےٰ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی۔ (بخاری۔ جلد اول۔ صـ۹۲ـ۴)

حتیٰ کہ

عطاء کہتے ہیں کہ کچھ حرج نہیں اگر اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے سوا اور کچھ مباشرت کرے۔[2] (ایضاً)

اس کے برعکس حضورؐ کا قیدی عورتوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک لڑکی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہو کر آئی تو وہ برہنہ سر تھی۔ حضورؐ اٹھے اور خود اپنی چادر مبارک اس کے سر پہ اوڑھا دی۔۔۔اسے مسجد نبویؐ میں اپنا مہمان رکھا اور بحفاظت اس کے اہل خانہ کے پاس پہنچا دیا۔ (شبلی۔ سیرت النبیؐ۔ جلد اول)۔ اللہ اکبر! جناب رحمت اللعالمینؐ کی یہی شان ہونی چاہئے تھی!!

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ لونڈیوں کا قصہ متقدمین تک ہی محدود نہ تھا۔ خود ہمارے دور کے اقامت دین کے مدعی بھی اسی مقام پر ہیں۔ مودودی (مرحوم) کے فتاویٰ نظری تھے۔ ان کا عملاً کیا نتیجہ تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سابقہ (بھٹو) حکومت کے زمانے میں 'پارلیمان' میں ایک جید مولانا صاحب نے مطالبہ کیا تھا کہ کم از کم ایک لونڈی رکھنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

پاکستان کے آئین بابت ۱۹۷۳ء میں غلامی کی ہر نوع کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس آئین کی ترمیم ہمارے علماء حضرات کے منشاء کے مطابق ہوئی تو وہ یقیناً اس شق کو منسوخ کر دیں گے۔

غلامی کے بعد جنسیات کی طرف آئیے۔ اس باب میں بھی یہ حضرات اسی مقام پر .... کھڑے ہیں جس مقام پر دورِ ملوکیت کے علماء اور فقہا تھے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

(۱) نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔
(تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صـ۵۷۱ـ نیز ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

لہٰذا اس لونڈی کو کسی کا باپ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اسمیں لونڈی کی رضامندی کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح نکاح کے لئے نابالغ لڑکی کی رضامندی یا عدم رضامندی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو نابالغ لڑکی اور لونڈی کی ایک ہی حیثیت ہو جاتی ہے۔

---

[1] عزل سے مطلب ہوتا ہے مباشرت کے وقت مادہ منویہ کا باہر ٹپکانا۔
[2] وطی فی الدبر کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے۔

باقی رہی نابالغ لڑکی کے ساتھ مجامعت۔ تو اس کے تو تصور تک سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے ۔ یہ شکل تو حیوانات میں بھی نہیں ملتی ۔

(۲) ان کے ہاں استمنا بالید (MASTURBATION) کی بھی اجازت ہے

(۳) اور متعہ کی بھی ۔ (حوالوں کے لئے دیکھئے مطالب القرآن ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۲۷۵ ۔ ۴۰۳)

(۴) حوروں کے متعلق انہوں نے کہا ہے :-

کفار کی لڑکیاں جو کمسنی میں وفات پا گئی ہوں انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا ۔

(ایشیا ۔ ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)

تفسیر میں کہا گیا ہے کہ یہ ان والدین کی کمسن (وفات شدہ) لڑکیاں ہوں گی جو جنت میں جانے کے مستحق نہیں ہوں گے ۔ وہ ہمیشہ نوخیز رہیں گی ۔ (تفہیم القرآن ۔ جلد چہارم ۔ صفحہ ۲۸)

ذرا صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے ! ہم میں سے کتنے ہی ہوں گے جن کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں (بچپن میں) وفات پا گئی ہوں گی ۔ سوچئے کہ ان کے دل پر کیا گزرے گی جب وہ تصور کریں گے کہ ان کی ننھی سی بچی نوخیز بنا کر کسی مرد کے حوالے کر دی جائے گی کہ وہ اس سے متمتع ہو ! بالخصوص یہ سوچئے کہ غیر مسلموں کے دل میں اس تصور سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کے کس قدر شدید جذبات نہ ابھریں گے ؟

(۵) حوروں کا جنت میں کیا مصرف ہوگا ؟ فرماتے ہیں :-

مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی ۔

(تفہیم القرآن ۔ جلد پنجم ۔ صفحہ ۲۶۷)

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ مومنین کی بیویاں تو ان کے محلات میں رہیں گی ۔ یہ حوریں جو ان کی سیرگاہوں میں لطف و لذت کا سامان بہم پہنچائیں گی ، ان کی حیثیت کیا ہوگی ؟ "لطف و لذت بہم پہنچانے کا ذریعہ !" (ذریعہ کا لفظ قابلِ غور ہے)

---

(۵)

ان تفصیلات کا جب بھی کوئی خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرے گا تو اس کے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ان کے دل و دماغ پر جنسیات اس قدر شدت سے چھائے رہتی ہے اور عورت کی حیثیت ان کے نزدیک ، جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ ہونے سے زیادہ کچھ نہیں ! اقبالؒ کے الفاظ میں :

آہ ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار !

یہ سب نتیجہ ہے اس تھیا کریسی کا جس نے (سلاطین اور ان کے حواریوں کی خوشنودی کے لئے) جنسیات کی ان تمام انواع کو "شرعاً" جائز قرار دے دیا اور قوم کے لئے بدنہادی کے پھاٹک کھول دیئے ۔ پھر یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جن حضرات کی طرف یہ قوانین اور تفاسیر منسوب ہیں فی الواقعہ انہوں نے ہی انہیں مرتب کیا یا یہ کسی سازش کے تحت مرتب کسی اور نے کئے تھے ، اور جعلی روایات کی طرح منسوب ان فقہا اور ائمہ کی

حذف کر دیئے گئے۔ اس زمانے میں چھاپے خانے تو ہوتے نہیں تھے کہ یہ ان حضرات کی موجودگی میں ہی کتابوں میں محفوظ ہو جاتے لیکن ان کے مصنف کوئی بھی ہوں، انہیں احکامِ شریعت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور اسی حیثیت سے انہیں نافذ کیا جاتا ہے۔

عورتوں کے متعلق جو احکام مروّج ہیں اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کے وضع کرتے وقت ذہنوں میں لونڈیوں ہی کا تصور تھا۔ مثلاً:-

(۱) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے لونڈی کو حقِ انتخاب حاصل نہیں تھا کہ وہ کس خریدار کو پسند کرے اس کے ساتھ جائے۔ اس کا فیصلہ نخاس کرتا تھا۔ یہی صورت ہمارے یہاں نکاح کی ہے۔ نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا والد یا ولی اپنی مرضی سے جہاں جی چاہے کر سکتا ہے۔ بالغ لڑکی کا نکاح بھی ولی کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

(۲) لونڈی کا مالک اسے جس وقت چاہے گھر سے نکال باہر کر سکتا تھا۔ یہی کیفیت منکوحہ بیوی کی ہے۔ اسے اس کا خاوند جب چاہے "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر الگ کر سکتا ہے۔

(۳) اس کے برعکس لونڈی اپنی مرضی سے اپنے مالک کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اسی طرح عورت بھی جب جی چاہے مرد کو طلاق دے کر اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔ طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

(۴) مرد جب جی چاہے اور لونڈیاں لا سکتا تھا۔ اسی طرح خاوند جب جی چاہے اور بیویاں کر سکتا ہے۔ اس پر پہلی بیوی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

(۵) جس طرح لونڈی کا مالک اسے مار پیٹ سکتا تھا اسی طرح خاوند کو بھی، بیوی کو مارنے پیٹنے کی اجازت ہے۔

(۶) لونڈیاں کاروبارِ حکومت میں دخیل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسی طرح عورتوں کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ (اب تو یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ انہیں ووٹ دینے کا بھی حق حاصل نہیں۔ اور اگر بامرِ مجبوری انہیں اس کا حق دینا ہی پڑا تو مرد کے مقابلہ میں عورت کا ووٹ نصف شمار کیا جائے گا)۔

عورتوں کی تذلیل کے لئے اسی قسم کے احکام کچھ کم نہ تھے جو مزید تحقیر کے لئے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں۔

عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا نحوست ان تین چیزوں میں ہے۔ "عورت، گھر اور گھوڑا"۔ (بخاری۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۵)۔

نیا یہ کہ

اسامہ بن زیدؓ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، میرے پیچھے مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ ضرر رساں باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۵)۔

حتیٰ کہ

حضرت عمران بن حصینؓ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں کے لوگوں میں اکثر فقراء پائے اور میں نے دوزخ میں دیکھا تو وہاں کے اکثر لوگ عورتوں کو دیکھا۔ (بخاری۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۲۹)۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کی اشاعت بابت ۳ مارچ ۱۹۸۳ء میں نادر عقیل انصاری نامی کسی صاحب کا ایک مضمون

شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اسلام کا قانون شہادت اور خواتین"۔ اس میں انہوں نے عورت کے ناقص العقل ہونے کے ثبوت میں لکھا ہے :-

> صحیح بخاری میں کتاب الشہادت میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ کیا عورت کی گواہی ایک مرد کی نصف گواہی کے برابر نہیں! صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں! آپ نے فرمایا، یہی اُن کی عقل کی کمی (کی نشانی) ہے[1]
>
> صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ عورتوں میں عقل اور دین دونوں کی کمی ہے۔ ایک عورت نے پوچھا، حضورؐ! ہم میں عقل اور دین کی کمی کیسے ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ عقل کی کمی تو اس سے ظاہر ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔ اور دین کی کمی یہ ہے کہ ایام حیض میں نہ نماز ہے نہ روزہ۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ جب تک ان روایات اور فقہ کے احکام کو غیر متبدل، اور ابدی اسلام قرار دیا جائے گا، عورتوں کی حیثیت لونڈیوں کے مماثل ہی رہے گی۔ اور جب تک عورت کا یہ مقام رہے گا، مرد اور عورت کی مساوات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اصل سوال یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے عورت کا مقام کیا ہے؟ یا اس قانون کا یا اُس قانون کا۔ اور اس سوال کا حل اسی صورت میں مل سکے گا جب یہ اصول تسلیم کیا جائے کہ اسلام میں سند قرآنِ کریم ہے۔ قرآن کریم نے ایک خطاب یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ "کہہ کر انسانوں سے کیا ہے، اور دوسرا خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر مومنین یا مسلمانوں سے۔ آپ بنظرِ غائر دیکھئے۔ کسی جگہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ سے مراد صرف مرد نہیں، نہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں مخاطب صرف مردوں سے ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے النَّاس (نوعِ انسان) میں بھی مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں[2]۔ اور مومنین میں بھی دونوں شامل۔ لہٰذا بحیثیت انسان اور بحیثیت مومن، مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا۔ نوعِ انسان بھی مردوں اور عورتوں دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور امتِ مسلمہ بھی مردوں اور عورتوں دونوں سے مرکب۔ لہٰذا ان کے مقام میں فرق کرنا قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ اس جگہ تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ ہم قرآن مجید کی متعدد آیات پیش کر کے بتاتے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کو کس طرح دوش بدوش سامنے لایا گیا ہے۔ (تفصیل کے لئے

---

[1] بخاری جلد اول۔ صفحہ ٦٠٣۔

[2] ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ قرآن کے انگریزی ترجموں میں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کا ترجمہ بالعموم "O! MAN KIND" کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب نوعِ انسان ہوتا ہے، لیکن نظر بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے جیسے "WOMEN" اس میں شامل نہیں۔

دیکھئے طلوع اسلام، بابت مئی۔ جون ۱۹۸۲ء میں شائع شدہ مقالہ بہ عنوان "عورت قرآن کے آئینے میں")۔

ایک فرق البتہ ضرور ہے۔ بقائے نسل، مشیت خداوندی کا پروگرام ہے اور اس کے لئے مؤنث اور مذکر کی تخلیق اور ان کا اختلاط لاینفک۔ تذکیر و تانیث ہر نوع میں موجود ہے اور ان کے حیاتیاتی فرائض (BIOLOGICAL FUNCTIONS) الگ الگ ہیں۔ لیکن اس تفریق سے انسان ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک ہی نوع کے برابر کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کے فرائض کے سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے خود ہی احکام نازل فرما دیئے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حقِ حکومت حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ کہنا کہ "مرد، عورتوں پر حاکم ہیں" حقِ حکومت کا دعوےٰ کرنا ہے جو قرآن کی رُو سے کھلا شرک ہے۔ ہمارے ہاں مردوں کی طرف سے دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ "عورتوں کو کیا حقوق ملنے چاہئیں اس کا تعین ہم کریں گے"۔ ان سے کوئی پوچھے کہ بنیادی حقوقِ انسانیت خود خدا نے مقرر کر دیئے ہیں جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ آپ عورتوں کے حقوق مقرر کرنے کے خدائی اختیارات کے کیسے مالک بن گئے؟ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی ذہن پر لونڈیوں کا تصور مسلط ہے جن کے حقوق اُن کے مالک مقرر کیا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام بنی آدم (نوعِ انسان) کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ اس ارشادِ خداوندی کی رُو سے، مرد اور عورت دونوں یکساں تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔ لہٰذا، کوئی ایسا قرینہ، فیصلہ، حکم یا قانون جس سے عورت کی تذلیل ہوتی ہو یا اس کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہو، وجہِ تذلیلِ انسانیت ہے اور بارگاہِ خداوندی میں جرمِ عظیم۔ ایسی روایات جن سے اس قسم کی تذلیل و تحقیر ثابت یا مترشح ہوتی ہو، بالبداہت وضعی تصور ہوں گی۔ حضورؐ کی طرف صرف اُس روایت کی نسبت صحیح سمجھی جائے گی جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔

لیکن یہی بات تھیاکریسی پر گراں گذرتی ہے۔ انہیں قرآن سے چڑ ہی اس لئے ہے کہ اس سے ان کے لئے عورتوں پر حکومت کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ جب لونڈیوں کے سوال پر علامہ اسلم جیراجپوری اور مودودی (مرحوم) میں بحث ہوئی ہے تو انہوں نے (مودودی مرحوم نے) کہا تھا کہ

> مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ صہ ۲۹۲)

یہ حضرات۔ روایات پر زور ہی اس لئے دیتے ہیں کہ اس سے تھیاکریسی کے لئے حکمرانی کی بڑی وسیع گنجائش نکل آتی ہے۔ قرآن تو ہمالیہ کی طرح محکم ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ منزل من

اٹل اور چٹان کی طرح اپنے مقام پر اٹل۔ اس کے برعکس احادیث لاکھوں کی تعداد میں ہیں[1] جن میں چھوٹی اور سچی ہر قسم کی روایات موجود ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس سے ہر ایک کو اس کی گنجائش حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی منشاء کے مطابق حدیث کا انتخاب کرے۔ یہ جو آپ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر مختلف فرقوں کے اختلافات دیکھتے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ان میں سے کوئی فرقہ بھی "منکرِ حدیث" نہیں۔ ہر ایک اپنے مسلک کی تائید میں حدیث پیش کرتا ہے۔ سو جس (MATERIAL) میں اس قدر گنجائش موجود ہو، اُسے یہ حضرات کس طرح اتھارٹی تسلیم کرنا چھوڑ دیں؟ مودودی مرحوم نے اس اتھارٹی میں اور بھی وسعت پیدا کر لی تھی۔ مختلف فرقوں نے، اپنے اپنے معیار کے مطابق غلط اور صحیح روایات میں تفریق کر رکھی ہے لیکن مودودی مرحوم نے کہا کہ وہ اس تقسیم و تفریق کے پابند نہیں۔ ان کے نزدیک "مزاج شناسِ رسول" احادیث کے تمام مجموعوں کو اپنی نگاہ سے پرکھتا ہے اور جسے چاہے قابلِ قبول قرار دے سکتا ہے، خواہ متقدمین کی تقسیم اسے کیسی ہی کیوں نہ سمجھے۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے تھیاکریٹک ڈکٹیٹرشپ کی کس قدر وسیع گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ (اُس زمانے کے جمعیتِ اہلِ حدیث کے صدر) مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) نے مودودی مرحوم کے اس دعوے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاءاللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ ۶۳)

لیکن جماعتِ اہلِ حدیث کا سُنّتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کا یہ جہاد بھی مولانا مرحوم کے ان الفاظ تک محدود تھا۔ حتیٰ کہ جب مودودی مرحوم نے یہ بھی کہہ دیا کہ "کتاب و سُنّت کے مطابق کوئی ضابطۂ قوانین ایسا نہیں بن سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں"۔ تو بھی سُنّت کو دین ماننے والوں نے اُن سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ جب سُنّت کی رُو سے ایسا ضابطۂ قوانین بن نہیں سکتا تو پھر سُنّت کے ماننے کا فائدہ کیا ہے؟ حتّٰی کہ جب اُنہوں نے، کتاب و سُنّت دونوں کو چھوڑ کر کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو اس کے خلاف بھی اُنہوں نے کچھ نہ کہا، حالانکہ رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے مسئلوں تک پر یہ آپس میں ہزار برس سے نبرد آزما چلے آ رہے ہیں!

بہرحال، جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اُمت میں جو خلفشار پیدا ہو رہا ہے اور آئے دن جو فسادات کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کی وجہ یہ قائلین اور وہ قائلین نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن کو قانون کی اصل و بنیاد تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ اور یہی وجہ ہے جو عورت کا مقام بھی متعین نہیں کیا جاتا۔ جب تک یہ نہیں ہوگا

---

[1] (بقول مولانا سندھی مرحوم) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے کہا ہے کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں۔ (مقامِ حدیث۔ صفحہ ۲۲۳)

نہ معاشرہ میں اسلام کا نفاذ ہو سکے گا۔ نہ آئے دن کے جھگڑے ختم ہو سکیں گے۔ بلکہ آپ دیکھئے گا کہ جوں جوں مزید قوانین مرتب ہوں گے اختلافات بڑھتے چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اختلافات ختم کرنے کا ایک ہی طریق بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)

جس معاملہ میں بھی اختلاف پیدا ہو اس کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے کراؤ۔

ہمارے تمام تنازعات کا حل اسی میں ہے۔

ایک استفسار

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ایک استفسار موصول ہوا۔ ہم نے (طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۸۳ء) میں عورت کی شہادت کے ضمن میں لکھا تھا کہ قرآن نے شہادت دینے والی عورت کے ساتھ اس کی ایک ہمنوا کو کھڑا کرنے کی ضرورت یہ بتائی تھی کہ اُس زمانے میں عورتوں کی یہ حالت تھی کہ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝ (۴۳/۱۸) " وہ زیورات میں پلی ہوئی ہے اور دوسروں کے معاملات تو ایک طرف) خود اپنے معاملہ کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی"۔ سوال یہ پوچھا گیا ہے کہ کیا یہ عورت کی فطری حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ واضح طور پر بات کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی یا یہ اس ماحول کا نتیجہ تھا جس میں اُس زمانے میں اس کی پرورش اور تربیت ہوئی تھی؟ اور یہ کہ کیا قرآن سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ مناسب تعلیم و تربیت سے وہ واضح البیان ہو سکتی ہے؟

جواب

یہ اُس ماحول کی پروردہ عورتوں کا ذکر ہے۔ عورت کی فطری عدم صلاحیت کا بیان نہیں۔ قرآن کریم کے مطابق تعلیم و تربیت سے جس قسم کے افراد تیار ہوتے ہیں انہیں وہ اہل جنت کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ جنت کی عورتوں کے متعلق کہتا ہے کہ إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً ۝ (۵۶/۳۵) ان عورتوں کی ایسی تعلیم و تربیت ہوگی کہ وہ (گویا) ایک نئی مخلوق بن جائیں گی۔ جن کی ایک خصوصیت عُرُبًا ہوگی (۵۶/۳۷) یعنی نہایت فصیح البیان۔ قرآنی تعلیم و تربیت سے وہ (دورِ جاہلیت کی عورتیں) کیا سے کیا بن گئی تھیں اس کی ایک مثال تو حضرت عائشہؓ صدیقہ تھیں کہ جلیل القدر صحابہؓ حتٰی کہ خلفاء راشدین تک مشکل ترین مسائل کے حل کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور عظیم ائمہ فقہ اپنی فقہ کا انحصار ان کی روایات پر رکھتے تھے۔ وہ روایات جو ایک ہی عورت، یعنی خود حضرت عائشہؓ کی شہادت سے مستند تسلیم کی جاتی تھیں۔

قرآن کریم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے (۲۲/۴۱) اور اسی ضمن میں کہا ہے وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں"۔ یہ انہی "غیر مبین" عورتوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جس نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ امورِ مملکت تک میں بھی حصہ لے سکیں۔ اگر یہ فطرۃً ناقص العقل اور گونگی ہوتیں تو ایسی کس طرح بن جاتیں؟

بتقریب یوم پاکستان ۱۹۸۳ء

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

(پرویزؔ صاحب کا خصوصی درس)

بتقریب یومِ پاکستان (۱۹۸۳ء) باسمہٖ تعالیٰ

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں!

(عزمِ بلند کا پیکرِ آہنی ــــ قائدِ اعظمؒ)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

آج ہم جس تقریب کے سلسلے میں شریک درس ہوئے ہیں، اسے عام طور پر "یومِ پاکستان" کہا جاتا ہے۔ اس دن (یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو) قوم نے اسی لاہور میں، اُس مقام پر جہاں اب "مینارِ پاکستان" سربفلک ایستادہ ہے، ایک ــــ ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ ریزولیوشن کا اصطلاحی ترجمہ تو "قرار داد" کیا جاتا ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم عزمِ راسخ ہے۔ اس اعتبار سے اُس دن قوم نے اپنے ایک عزم کا اظہار کیا تھا۔ اور وہ عزم یہ تھا کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کریں گے جس میں قرآنِ کریم کی حدود و قیود کے مطابق اسلامی مملکت قائم ہوگی۔ کسی مقصد کے حصول کے لئے شرطِ اولیں عزم ہوتا ہے۔ جس قدر عظیم اور بلند وہ مقصد ہوگا اسی قدر محکم اور صمیم وہ عزم ہوگا۔ یومِ پاکستان کو جس مقصد کے حصول کے لئے اظہارِ عزم کیا گیا تھا، مسلمان کی زندگی میں اس سے زیادہ بلند کوئی مقصد ہو نہیں سکتا۔ یعنی منشائے ایزدی کے مطابق ایک مملکت یا نظام کا قیام۔

عزم یا ارادے کی بنیاد اپنے مقصدِ پیشِ نظر کی صداقت پر یقینِ محکم ہوتی ہے۔ جس قدر یقین پختہ اور محکم ہوگا، اسی قدر اس کے حصول کے لئے عزم راسخ اور استوار ہوگا۔ قرآنِ کریم نے مردانِ مومن کے مقاصدِ حیات میں عزم کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حضراتِ انبیاءِ کرام کو ان کے مشن میں جو کامیابی ہوئی تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اولوالعزم تھے۔ اسی کی تلقین حضور نبی اکرمؐ کو کی گئی جب کہا کہ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (۴۶/۳۵)۔ کشمکشِ حق و باطل میں پیش آمدہ مشکلات کے مقابلہ کے لئے اس طرح ثابت قدم رہو جس طرح انبیاءِ سابقہ ثابت قدم رہے تھے کیوں کہ وہ صاحبانِ عزم تھے۔ ان کے ارادے بڑے پختہ تھے۔ دوسری طرف کہا کہ "آدم" سے جنت اس لئے چھن گئی کہ لَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۝ (۲۰/۱۱۵) اس کا عزم راسخ نہیں تھا۔

قوموں کی زندگی کا راز بھی اس یقینِ محکم میں ہے جس کا لازمی نتیجہ عزمِ صمیم ہوتا ہے۔ جب قوم کے یقین میں تزلزل واقعہ ہو جائے اس کا عزم بھی محکم نہیں رہتا۔ اور جب عزم محکم نہ رہے تو پھر کسی

مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

یقیں مثلِ خلیلؑ آتش نشینی | یقیں اللہ مستی، خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار | غلامی سے بتر ہے بے یقینی

وہ امت کی زبوں حالی کا ماتم کرتے ہوئے کہتے تھے کہ

نگہبانِ حرم معمارِ دَیر است | یقینش مردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید | کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

وہ مسلمان سے کہتے تھے کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے | یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

یقین کا دوسرا نام ایمان ہے۔ اور یہی وہ نورانی شمع ہے جس سے انسانی زندگی کے تمام راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں ؎

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا | بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی!

اُمتِ مسلمہ کو جو کچھ حاصل ہوا تھا اسی یقینِ کامل اور ایمانِ محکم کا تصدق تھا۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری | یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اس سے قوم کو جو قوت حاصل ہوتی ہے، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا | نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اللہ تعالےٰ نے جماعتِ مومنین کو جو پروگرام دینا تھا اسے اپنی کتاب کے اوراق میں مکمل اور محفوظ کرنے کے بعد، آخری دو سورتوں میں اسے متنبہ کیا کہ اسے کون کون سے خطرات کی طرف سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سرِفہرست تھا۔ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ (۱۱۳/۴) ان جماعتوں کی طرف سے پیدا کردہ شر جو دلوں میں وسوسے پیدا کر کے تمہارے عزمِ راسخ کو متزلزل کرنے کی کوشش کریں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قوموں کی زندگی میں عزمِ راسخ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ یہی عزمِ راسخ تھا جس کا اظہار ہماری قوم نے یومِ پاکستان کو کیا تھا۔ لیکن قوم کا یہ عزم درحقیقت آئینہ تھا اس کے قائد کے اس عزمِ بلند کا جس کا مظاہرہ اس نے اس عہدِ مسلسل میں قدم قدم پر کیا، جس کے بل بوتے پر اس نے انگریز، ہندو اور خود پاکستان کے مخالف مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی، اور چاروں طرف سے مشکلات کے ہجوم اور تصادمات کے انبوہ میں گھرنے کے باوجود وہ کامیابی حاصل کی جس کی مثال تاریخِ عالم میں کم ملے گی۔ میں آج کی نشست میں قائدِ اعظمؒ کے اس عزمِ بلند کی کچھ مثالیں پیش کروں گا۔

---(۱)---

جیسا کہ معلوم ہے، قائدِ اعظمؒ (یا یوں کہئے کہ مسٹر جناحؒ) نے اپنی زندگی کا (پہلا) حصہ نیشنلزم کے مسلک کی تائید اور ترویج کی جد و جہد میں بسر کیا۔ نیشنلزم سے مراد تھی، ہندوستان میں بسنے والے

تمام باشندوں پر مشتمل (بلا لحاظ مذہب و ملت) متحدہ قومیت کی تشکیل۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سالہا سال کی کدوکاوش میں ناکامی کے بعد وہ سیاست سے اس قدر بددل ہوگئے کہ انہوں نے وطن کو خیرباد کہہ دیا اور انگلستان جاکر مقیم ہوگئے۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ ان کا ارادہ مستقل طور پر وہیں سکونت پذیر ہوجانے کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہاں اپنے لئے ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ اسے حسن اتفاق کہئے یا قوم کی خوش بختی کہ علامہ اقبالؒ ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے تو مسٹر جناحؒ کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور انہیں ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ علامہ اقبالؒ کی نگہِ جوہر شناس اور دوررس نے جلد بھانپ لیا کہ ہندی مسلمانوں کی کشتی جس سیاسی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے، اسے وہاں سے جناحؒ کے پتوار ہی نکال سکتے ہیں۔ لیکن (اُس وقت) ان دونوں کے مقاصد اور مسالک میں جو اختلاف ہی نہیں، جو تضاد اور تصادم تھا وہ واضح تھا۔ لیکن اقبالؒ کی بلند نگہی اور جناحؒ کی کشادہ قلبی نے ایسا انقلابی اثر پیدا کیا کہ جناحؒ، اقبالؒ کا ہمرنگ و ہمنوا ہوکر ۱۹۳۴ء کے اواخر

جناحؒ کی وطن واپسی

(یا ۱۹۳۵ء کے اوائل) میں وطن واپس آگیا۔ اور یہاں سے ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس میں قدم اوّل مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا اثبات تھا۔ اُس وقت ہندوستان کے مسلمان اس قدر مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے کہ ان کی الگ مستقل قومیت کا تعین تو ایک طرف، انہیں کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بھی ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن جب قائداعظمؒ نے اس کا عزم کرلیا تو پھر ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کردیا اور اس کے عملی مظاہرہ کا موقعہ بہت جلد آگیا۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، جداگانہ انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ہندی مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں بڑا اہم اور نازک مقام تھا۔ اسے ان کی جداگانہ قومیت کا معیار قرار پانا تھا۔ اس کے لئے قائداعظمؒ نے سنٹرل پارلیمانی الیکشن بورڈ کی تشکیل کی۔ اس بورڈ میں مسلمانوں کی جس قدر مختلف الخیال جماعتوں کے نمائندگان شریک تھے، تاریخ کا طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے اس قدر مختصر سی مدت میں ان متضاد عناصر کو یکجا کس طرح کرلیا تھا؟ (مولانا) ظفر علی خان کی اتحاد ملت پارٹی کے بالمقابل مجلس احرار، جن میں آگ اور پانی کا بیر تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے بالمقابل جمعیت العلماء ہند کے سربرآوردہ نمائندگان مثل مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید۔ اس وقت حالات کس قدر ناسازگار تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ۸ جون ۱۹۳۶ء کو ہونے والے "مسلم لیگ کونسل اور پارلیمانی بورڈ کے" اجلاس کس جگہ منعقد ہوں۔ اسلامیہ کالج کا حبیبیہ ہال اس کے لئے موزوں خیال کیا گیا۔ اسلامیہ کالج اس انجمن حمایت اسلام کا تعلیمی ادارہ تھا جس کے استحکام اور فروغ میں علامہ اقبالؒ کے خونِ جگر کا معتدبہ حصہ تھا۔ علامہ نے اس کی اجازت کے لئے، انجمن کے اُس زمانہ کے صدر

۱۹۳۷ء کے الیکشن

نواب مظفر خان کے پاس اپنا آدمی بھیجا، اور (تاریخ اس سانحہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکے گی کہ) انہوں نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔ اور یہ اجلاس

مجبوراً برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوئے[1]۔ قائداعظمؒ کے عزم کو متزلزل کرنے کے لئے یہی دھچکا کچھ کم نہ تھا کہ اس کے بعد دھماکے پر دھماکے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان اور ان کے ساتھی، پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد جمیعت العلماء کی باری آئی۔ یہ حضرات کس بنا پر الگ ہوئے، اس کے متعلق مرزا ابوالحسن اصفہانی نے (جن کا ابھی پچھلے سال انتقال ہوا ہے) اپنی (نہایت پُر عقیدت) کتاب (QAID-E-AZAM, AS I KNEW HIM) میں بڑے تاسف انگیز اور حسرت آمیز انداز میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

پارلیمانی الیکشن بورڈ

> پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناحؒ کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاسی میدان میں داخل کر دیا ہے لیکن آخری روز انہی میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ چونکہ لیگ کو کامیاب کرانے کے لئے پراپیگنڈے کی مہم کا بڑی خوش اسلوبی اور سرگرمی سے چلانا ضروری ہے، ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پراپیگنڈے کا مرکز بنا دیا جائے بشرطیکہ اس مہم کا تمام خرچ لیگ برداشت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پروپیگنڈہ کی اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی (صفحہ ۲۳)

اس کے بعد اصفہانی (مرحوم) کہتے ہیں کہ: اس وقت لیگ کے خزانہ میں پچاس ہزار روپیہ تو ایک طرف، پچاس پیسے بھی نہیں تھے۔ اور ان مولانا حضرات کو اس کا بخوبی علم تھا۔ قائداعظمؒ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس وقت ہمیں خلوصِ نیت سے کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔ جب قوم میں اس کا احساس پیدا ہو گیا کہ ہمارا موقف حق پر مبنی ہے تو روپے کی کمی نہیں رہے گی۔ لیکن یہ حضرات اس سے مطمئن نہ ہوئے اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس سے جا ملے۔ اور پھر بقایا ساری عمر اس پروپیگنڈہ کے لئے وقف کر دی کہ جناحؒ اور مسلم لیگ کا نظریہ اور مسلک غیر اسلامی ہے اور ہندو کا موقف "عین مطابق اسلام" (ہاریا للعجب) پچاس ہزار روپے میں، کفر اسلام ہو گیا اور اسلام کفر۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ع قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند! اس ارزاں فروشی کا اندازہ اُس خط سے لگائیے جو پنڈت جواہر لعل نہرو نے ۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو جھانسی کے بائی الیکشن کے سلسلہ میں، مسٹر رفیع احمد قدوائی (مرحوم) کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:-

پچاس ہزار روپے کے عوض

---

[1] اقبال کے آخری دو سال (عاشق حسین بٹالوی ص ۳۰۲) لیکن مسٹر جمیل الدین احمد نے کہا ہے کہ یہ اجلاس پہلے میاں عبدالعزیز کے مکان پر اور پھر نیڈو ہوٹل میں منعقد ہوئے تھے۔ MUSLIM POLITICAL MOVEMENT- MIDDLE PHASE - P.160

جہاں تک کارکنوں کا تعلق ہے وہ باہر سے بھیجے جا چکے ہیں اور ابوالکلام آزاد نے اس کی بابت حسین احمد مدنی اور بشیر احمد کو مطلع بھی کر دیا ہے اور احمد سعید کو تار بھی دے دیا ہے۔ انہیں سفر خرچ دینا چاہئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ مالی امداد بھی فراہم کی جائے۔ اس سلسلہ میں سات سو روپیہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے[1]

یہ تھی قیمت دو قومی نظریہ کو خلاف اسلام اور متحدہ قومیت کو عین مطابق اسلام قرار دینے کی !

بورڈ سے علیحدگی

اس کے بعد احرار پارٹی کی باری آئی۔ یونینسٹ پارٹی کے سر فضل حسین (مرحوم) نے مشہور کر دیا کہ مسٹر جناح نے بمبئی کے تاجروں اور راجہ محمود آباد سے پارلیمانی بورڈ کے لئے کئی لاکھ روپے حاصل کئے ہیں۔ اس سے احرار کے چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ اس فنڈ میں سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ ان کے حصے میں ضرور آئے گا۔ لیکن پارلیمانی بورڈ نے اس کے برعکس یہ شرط عائد کر دی کہ جس امیدوار کو لیگ کا ٹکٹ دیا جائے گا اسے پانچ سو روپیہ بورڈ کے فنڈ میں جمع کرانا ہوگا۔ اس سے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ بھی مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے[2] اور پھر بقایا عمر جناح کو کافر قرار دینے کے "جہاد" میں گزار دی !

پنجاب میں یہ کچھ ہو رہا تھا تو مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ میں حالات اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھے۔ یو۔پی سے نواب چھتاری، سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خان نے بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور مسلم لیگ کے بجائے نیشنل اگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یاد رہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان کو ابھی چند ماہ قبل آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ یہ پارٹی کس قسم کی تھی اور ان حضرات کا ضمیر کس قسم کی مٹی سے اٹھا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جب نواب چھتاری نے یو۔پی کے گورنر کو ان ناموں کی فہرست بھیجی جنہیں پارلیمانی بورڈ میں شامل کیا جانا مطلوب تھا تو گورنر صاحب اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور نواب صاحب نے معافیاں مانگتے ہوئے وہ فہرست واپس لے لی۔ اور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے رفقا سمیت پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی[3] بہار سے سید حسین امام اور سید عبدالعزیز نے بھی بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے لیگ سے الگ ہو کر نہ صرف اپنی جداگانہ پارٹی ۔۔۔ کرشک پرجا پارٹی ۔۔۔ تشکیل کر لی بلکہ لیگ کے خلاف سب و شتم کا افسوسناک سلسلہ بھی شروع کر دیا[4]

پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور

ـه[1] JAMIL-UD-DIN AHMAD ______ MIDDLE PHASE OF MUSLIM POLITICAL MOVEMENT - P. 201.

ـه[2] عاشق حسین بٹالوی ص ۳۲۶ ۔ ـه[3] شریف المجاہد صاحب روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء

ـه[4] عاشق حسین بٹالوی: "اقبال کے آخری دو سال" (صفحہ ۳۴۲-۳۴۴)۔

راجہ غضنفر علی خان۔ راجہ صاحب (مرحوم) اس کامیابی کے بعد سیدھے یونینسٹ پارٹیؒ کے جلسے میں پہنچے اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر، یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔ سر سکندر حیات نے ان کا استقبال کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں انہوں نے فرمایا کہ

> راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایما سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے فوری بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے[1]

عزیزانِ من! آج (پچاس سال کے بعد) ان گڑے مردوں کو اکھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن (چوں کہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی) میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نئی نسل کو (جس نے وہ دَور دیکھا ہی نہیں) یہ بتلانے کی اشد ضرورت ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں قائدِ اعظمؒ نے اس مہم کا آغاز کیا تھا اور وہ کس قسم کے "رفقا" تھے جن کے ساتھ آپ کو پالا پڑا تھا! آپ سوچیے کہ اگر قائدِ اعظمؒ کے سوا کوئی لیڈر بھی ہوتا تو وہ ان حالات سے بد دل ہو کر مسلمانوں کے سیاسی میدان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا۔ لیکن یہ قائدِ اعظمؒ کا عزمِ راسخ تھا جس نے ایسے نامساعد حالات اور اس قسم کی ہمت شکن مایوسیوں کا کوئی اثر نہ لیا اور کامل استقامت اور استقلال اور پوری دل جمعی اور سکونِ قلبی کے ساتھ اس وادیٔ پُرخار میں مردانہ وار آگے بڑھتے چلے گئے۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ آگے بڑھتے گئے بلکہ ان کے حوصلے اور بھی بلند اور ان کی جرأتیں اور بھی بے باک ہو گئیں۔ (مثلاً) انہوں نے مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے للکار کر کہا تھا کہ

> میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے۔ اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

اس سے بھی چند ماہ پہلے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء) میں کہا کہ

> برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس کے پاس قوت ہو۔ لیکن ہم برطانیہ اور ہندو دونوں سے لڑیں گے۔

سچ ہے۔ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

---

[1] عاشق حسین بٹالوی۔ "اقبالؒ کے آخری دو سال" (صفحہ ۴۴۲ - ۲۵۲)۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کفر کے فتوے

لیکن اس جہاد میں ہندو کی تیغ و سناں اور انگریز کی توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ جگر پاش اور دل خراش ہمارے محافظانِ دینِ مبین کے کفر کے فتوؤں کے تیر و تبر تھے۔ انہی مولانا مدنی (مرحوم) نے جو پچاس ہزار روپیہ نہ ملنے پر لیگ سے الگ ہو کر، کانگریس کی آغوش میں جا بیٹھے تھے۔ فتویٰ صادر فرما دیا کہ

مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائد اعظم کافرِ اعظم ہے۔ (تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، صفحہ) اور اس مجلس احرار کے ایک ممتاز لیڈر (مولانا) مظہر علی اظہر نے۔ جس نے پانسو روپے پر لیگ کا ساتھ چھوڑا تھا، قائد اعظمؒ کی شادی کے سلسلہ میں ایک سراسر غلط اتہام لگاتے ہوئے کہا تھا کہ

> اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا۔ یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم (معاذ اللہ)۔

اور خود مجلس احرار نے اپنی ایک قرارداد میں کہا تھا کہ

> یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ غیر اسلامی ہے۔

دوسری طرف سے آواز آتی تھی کہ

> بحکم شریعت مسٹر جینا اپنے عقائدِ کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے۔ یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد اور شرالخِتام ہے۔ اور بے توبہ مرے تو مستحق لعنت عزیز علامؒ؟
>
> (فرقہ بریلوی کی کتاب منجانب اہل سنۃ من اہل الفتنۃ۔ صفحہ ۱۲)

لیکن قائد اعظمؒ پر ان فتوؤں کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ایک تو وہ جانتے تھے کہ یہ حضرات ان سے کتنے پیسوں کا انتقام لے رہے ہیں[1]۔ اور دوسرے، انہیں اس کا بھی علم تھا کہ ان کے فتوے بدلتے کس آسانی سے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جب کانگریس نے ترکِ موالات کا ریزولیوشن پاس کیا تو جمعیۃ العلماء نے بھی قرآن و حدیث کی بنا پر ترکِ موالات کا فتویٰ دے دیا۔ پھر حالات بدلے۔ اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو نے کونسلوں کے مقاطعہ کی شرط اٹھا دی تو انہی مولوی صاحبان نے پہلا فتویٰ منسوخ کر کے کونسلوں میں داخلے کو جائز قرار دے دیا۔ ۱۹۳۶ء میں انہی مولویوں کو کانگریس سے کچھ ذاتی پرخاش ہوئی تو جھٹ آغا خان اور سر شفیع کی قیادت قبول کر کے جداگانہ

---

[1] اے کاش! اس وقت لیگ کے پاس پچاس ساٹھ ہزار روپیہ بھی ہوتا تو تحریک پاکستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اور مملکتِ پاکستان کا رنگ بھی کچھ اور۔ بعض اوقات کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات تاریخ کا رُخ بدل دیتے ہیں!

انتخاب کی حمایت اور نہرو رپورٹ کی مخالفت کا نیا فتویٰ صادر کر دیا۔[1]

(٠)

مخالفین یہ حربے استعمال کر رہے تھے اور جناحؒ کا یقینِ محکم اور عزمِ راسخ اُسے ان غوغا آرائیوں سے بے نیاز، جانبِ منزل رواں دواں لئے چلا جا رہا تھا۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود　　مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار
در گردہ سیمند رایہ ہوا ہائے شرق و غرب　　در بر گرفتہ ہمسفرانِ زبون و نزار
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود　　(پیامِ مشرق۔ صفحہ ۱۵۱)

۱۹۳۶ء کے انتخابات کے نہایت تلخ و یاس انگیز تجربات کے بعد قائداعظمؒ کے ناقابلِ شکست عزم نے اس تجویز پر صاد کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (اپریل ۱۹۳۸ء میں) اسی لاہور میں منعقد کیا جائے۔ علامہ اقبالؒ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی۔ شاید وہ (غیر شعوری طور پر) اپنے ۱۹۳۰ء کے خواب کی محسوس تعبیر کا پُرکیف نظارہ اپنی آنکھوں سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سر سکندر حیات اور اس زمانہ کے خود پراونشل مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ (نواب سر شاہ نواز ممدوٹ) کی سازش سے وہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری تا آنکہ دو ہی سال بعد، وہ اجلاس، اسی لاہور میں، اس استقبالیہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام، جس کے صدر وہی نواب ممدوٹ تھے، اس شان و شکوہ اور عظمت و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا جس کی مثال تاریخ میں بمشکل ملے گی۔ اسی کی یاد میں آج کی ہماری یہ تقریب منعقد ہو رہی ہے۔

لیکن اس اجلاس کا انعقاد قائداعظمؒ کی استقامت اور عزم کا امتحان اپنے آغوش میں لئے تھا۔ یہ داستان بڑی حیرت انگیز بھی ہے اور جراُت آموز بھی، اس لئے میں اسے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ شاہد ہی نہیں بلکہ اس کارزار میں خود بھی شریک تھا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت مسلم لیگ کی کس مپرسی کی جو حالت تھی اسے ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس سے اگلے سال آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی تجویز کو جس طرح ناکام بنا دیا گیا تھا، وہ بھی ہماری نظروں سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس مردِ آہن کی انتھک کوششوں اور بے پناہ ہمتوں نے دو ہی سال کے عرصہ میں قوم میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کی نظیر بھی تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ چنانچہ جب ۱۹۴۰ء کے اوائل میں

---

[1] ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۹ء (عاشق حسین بٹالوی صفحہ ۔۔)۔

یہ فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مارچ میں لاہور ہی میں منعقد ہوگا۔ تو قوم نے جس ذوق و شوق، جس جوش و خروش، جس دبدبہ اور طنطنہ سے اس فیصلہ کا استقبال کیا اُس سے نظر آتا تھا کہ یہ دو سال پہلے کی قوم نہیں۔ ایک نئی قوم ہے جو تازہ امنگوں اور پُر کیف آرزوؤں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ ہر نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ یہ قوم نہیں، پُر خلوص دلوں کا ایک سمندر ہے جس کی تلاطم خیزیوں کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ ہماری نئی نسل کی حرماں نصیبیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اس قوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں جو خلوص و ایثار کا شعلہ جوالہ تھی۔ اس نے اس قوم کو دیکھا ہے جو راکھ کا ڈھیر اور افسردگیوں اور مایوسیوں کا ماتم کدہ ہے۔ غالبؔ نے اس تقابل کو جس دل کش لیکن حسرت انگیز انداز سے بیان کیا ہے اس سے بہتر منظر کشی ممکن نہیں۔ اس نے سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا وہ آج ہمارے حال پر صادق آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا:-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

بہرحال، اس اعلان پر کہ لیگ کا سالانہ اجلاس، مارچ میں لاہور میں منعقد ہوگا، سارا ملک، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا بہار آفریں منظر پیش کر رہا تھا، اِدھر قوم کی یہ کیفیت تھی لیکن دوسری طرف اس کے مخالفین کی چھاتی پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ ان کی مذموم کوشش تھی کہ کچھ ایسا کیا جائے کہ یہ اجلاس منعقد نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے لئے کانگریس کے منتخب صدر (مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم) لاہور آئے اور سر سکندر حیات (مرحوم) سے خفیہ ملاقات کی۔ اس میں کیا طے پایا اس کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کا ولولۂ شوق تیز تر ہوتا گیا۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ کہ جلوسِ صدر مسلم لیگ (قائد اعظمؒ) کے عین دو دن پہلے (۱۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی) شام کے قریب یہ وحشت انگیز خبر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی کہ لاہور میں خاکساروں کے جلوس پر گولی چلا دی گئی ہے۔ اس سے تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ بلکہ کرفیو لگا دیا گیا۔ مجھے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ذرا پہلے مل گئی تھی۔ میں (علامہ مشرقی مرحوم سے ملنے کے بعد، جو اس وقت دہلی آگئے تھے) اس خبر کو قائد اعظمؒ کے گوش گزار کرنے کے لئے ان کے دولت کدہ پر پہنچا۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں ان سے اس موضوع پر باتیں کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی

گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ مجھے اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا۔ قائداعظمؒ نے

لاہور کا اجلاس

بعد میں بتایا کہ لاہور سے نواب شاہ نواز (مرحوم) چیئرمین استقبالیہ کمیٹی کا فون تھا۔ ادھر سے کیا کہا جا رہا تھا اسے تو میں سن نہیں سکتا تھا۔ ادھر کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک فقرہ پر، پورے دبدبے اور طنطنے کے ساتھ کوہ آسا عزم و اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخری فقرہ کچھ اس طرح کا تھا کہ خواہ مارشل لا نافذ ہو یا کرفیو لگے۔ یہ اجلاس منعقد ہوگا اور ہر حال میں ہوگا۔ میں پروگرام کے مطابق لاہور پہنچ رہا ہوں۔ چنانچہ وہ پروگرام کے مطابق لاہور پہنچے اور جس شان و شوکت، لیکن انتہائی سکوت و سکون کے ساتھ وہ اجلاس منعقد ہوا، چشمِ فلک نے اس کی مثال کم دیکھی ہوگی۔

(ضمناً) معلوم نہیں! یہ قائداعظمؒ کی ذات کے ساتھ لوگوں کی والہانہ عقیدت اور احترام تھا یا ان کی شخصیت کی سحر انگیزی۔ اس زمانے میں قائداعظمؒ اردو کے چار لفظ بھی نہیں جانتے تھے۔ کیفیت یہ ہوتی تھی کہ لاکھوں کا مجمع ہے جس میں نوے فی صد سامعین انگریزی کا ایک لفظ نہیں سمجھتے۔ قائداعظمؒ، دو دو تین تین گھنٹوں تک انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اس لاکھوں کے مجمعے میں کسی کے کھانسنے تک کی آواز بھی سنائی دے! اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قوم کس قدر (DISCIPLINED) ہو چکی تھی۔ آج سیاسی بیداری نام رہ گیا ہے ہنگامہ خیزی، غوغا آرائی اور فساد انگیزی کا۔ یہ قائداعظمؒ کی تربیت یا ان کے ذاتی کردار کا غیر شعوری اثر تھا کہ قریب دس سال تحریکِ پاکستان کے دوران، جب چاروں طرف مخالفت کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔ وابستگانِ تحریک کی طرف سے نہ کسی جگہ کسی قسم کا ہنگامہ برپا کیا گیا، نہ فساد کھڑا کیا گیا۔ قوم پر راہ نمایانِ قوم کی سیرت و کردار کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ منافقانہ نہ ہو بلکہ خلوص اور صداقت پر مبنی ہو۔ قائداعظمؒ نے قوم کو، یقین، اتحاد اور ضبط کا جو سلوگن دیا تھا، قوم اس کی محسوس علامت بن گئی تھی۔ ان پُرآشوب اور صبر آزما حالات میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی جسے اس تحریک کے سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ اس ستم ظریفی اور بوالعجبی کو کس طرح فراموش کر دے گی کہ جس وقت "مسٹر جناح" یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں حضور نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کے اتباع میں اسلامی مملکت قائم کی جائے گی، (مولانا) ابوالکلام آزاد (جنہیں کسی زمانے میں امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا) رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں یہ دہائی دے رہے تھے کہ

> وقت کی ساری تحصیلیں ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو تھکنے نہیں دیتا۔

مسٹر جناح یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر، ہندوؤں، بلکہ ساری دنیا کے غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مولانا آزاد یہ فرما رہے تھے کہ

یہ تخیل کہ مسلمان بر بنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلمان۔ انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔ میں فخر سے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک، اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔

قرار داد پاکستان کی مخالفت، اکیلے (مولانا) ابوالکلام آزاد کی طرف سے ہی نہیں ہوئی تھی۔ تمام نیشنلسٹ مسلمان اس کی مخالفت میں انتہائی گرم جوشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جمعیت العلماء ہند (جس کے نامور سربرآوردگان کے کردار کی ایک جھلک ہم انتخابات ۱۹۴۶ء کے پچاس ہزار روپیہ کے مطالبہ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں)۔ احرار اسلام۔ سرخ پوش۔ وغیرہم، سب کی طرف سے مخالفت ہوئی تھی۔ سندھ کے خان بہادر اللہ بخش (مرحوم) نے اس قرار داد کے متعلق کہا تھا:-

یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔

عبدالرحمٰن سرحدی نے کہا:-

یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا:-

اس سے برطانوی حکومت قائم رہے گی۔

احراری لیڈر (مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا:-

یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔ اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا۔

سب سے زیادہ دلچسپ کردار سر سکندر حیات (مرحوم) کا تھا۔ ان کی مخالفت کے علی الرغم جب یہ اجلاس منعقد ہو گیا تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ وہ اس کمیٹی میں شامل ہیں جس نے قرار دادِ پاکستان کا مسودہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد ہم انہیں اسلامیہ کالج کے طلبا کو یہ نصیحت کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو لیکن یاد رکھو۔ تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کرنا ہو۔ یہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہوگا۔

سر سکندر کی طرف سے اس مخالفت کا نتیجہ تھا کہ ان کی پارٹی (یونینسٹ) کے سربراہ سر چھوٹو رام کہتے تھے کہ

سر سکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیر اعظم تو ایک طرف، کوئی ذمہ داری کا عہدہ لینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہوگی۔

مخالفتوں کے اس تمام ہجوم میں، عزم راسخ کا یہ فولادی پیکر، چٹان کی طرح کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اور آج (یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو)

میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے براعظم میں پاکستان کے سوا کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا۔

(۰)

یہ مخالفتیں ہنگامی اور وقتی تھیں۔ جوں جوں ان کا اثر کم ہوتا گیا، یہ ماند پڑتی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ شدید اور دوررس مخالفت ایک اور گوشے کی طرف سے ہوئی۔ یہ مخالفت تھی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے

مودودی مرحوم کی مخالفت

ان کی طرف سے مخالفت بڑی غیر متوقع بھی تھی۔ اور تعجب انگیز بھی۔ یہ پہلے کانگریسی تھے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک نیشنلسٹ علماء کے آرگن الجمعیۃ کے حلقۂ ادارت میں شامل رہے اور گاندھی جی کی سوانحعمری بھی مرتب کی۔ پھر یہ حیدرآباد (دکن) چلے گئے اور وہاں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ دو قومی نظریہ کی تائید میں مضامین لکھتے رہے۔ اس سے یہ مسلم لیگی حلقوں میں قدرے مقبول ہونے تو یہ کہتے ہوئے پنجاب کی طرف آ گئے کہ وہ علامہ اقبالؒ کے مشن کی تکمیل کے لئے آ رہے ہیں۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے جب اپنے پاؤں جما لئے تو بقایا ساری عمر (تقسیم ہند سے پہلے تحریک پاکستان کے دوران اور تشکیل پاکستان کے بعد مرتے دم تک) علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصورِ پاکستان کی مخالفت میں بسر کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے مشن میں سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے وہ نقوش مٹ جائیں گے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں مذہبی پیشوائیت کی وساطت سے اسلام پر لگ چکے تھے اور جس سے اس کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اور قائداعظمؒ نے بار بار اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ مودودی (مرحوم) کی پہلے تو یہ اسکیم تھی کہ پاکستان بننے ہی نہ پائے۔ اور جب یہ بن گیا تو انہوں نے یہ اسکیم مرتب کی کہ جس تھیاکریسی کو مٹانے کے لئے اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اس مملکت کو قائم کرایا ہے، اس میں وہی تھیاکریسی مسلط رہے۔ چنانچہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) اس وقت پاکستان میں جو تھیاکریسی مسلط ہو رہی ہے، وہ مودودی (مرحوم) کی اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ مودودی (مرحوم) اپنے مشن میں کامیاب رہے ہیں۔ چونکہ طلوع اسلام کا مشن، پاکستان میں (اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کے) اُس اسلام کو برسرِاقتدار لانا تھا جس میں تھیاکریسی کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اس لئے وہ مودودی (مرحوم) کی اسکیم کی مخالفت میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ ہمسفر رہا۔ اس سلسلہ میں، اس میں مسلسل اور متواتر لکھا جاتا رہا اور اس کثرت سے کہ اسے یکجا کرنے سے ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں۔ طلوع اسلام میں جو کچھ لکھا گیا اسے بار بار دُہرانے کی ضرورت اس لئے پیش آتی رہی کہ (دیگر مخالف جماعتوں نے) تشکیل پاکستان کے بعد اس کا اعتراف کر لیا کہ انہوں نے واقعی اس تحریک اور مطالبہ کی مخالفت

کی تھی لیکن مودودی (مرحوم) اور ان کی جماعت برابر یہ کہتی چلی گئی کہ انہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت قطعاً نہیں کی تھی۔ میں نے اس وقت اس تلخ داستان کے دہرانے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس وقت جس اسلام کو پاکستان میں نافذ کیا جا رہا ہے وہ مودودی (مرحوم) ہی کی اسکیم کا نتیجہ ہے۔

مرحوم نے (پنجاب آنے کے بعد) تحریکِ پاکستان کے خلاف بالعموم اور قائد اعظمؒ کے خلاف بالخصوص اپنے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جسے بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصہ سوم۔ ذیل میں جو اقتباسات پیش کئے جائیں گے وہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن سے ماخوذ ہیں جو آرمی پریس۔ دہلی۔ میں چھپا تھا۔ ان اقتباسات کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ مودودی (مرحوم) نے کہا کہ وہ کون سے مسلمان ہیں جن کے الگ قوم ہونے کا آپ دعوے کر رہے ہیں؟

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اُن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے، کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (جلد سوم صفحہ ۱۳۰)

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۱۶۶)

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس کی تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۵۶)

دوسری جگہ لکھا:-

اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بیٹر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (جلد سوم ص۱۳۴)

اسلام کو تانبے کے ان سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اس کے نزدیک، زیادہ قیمتی ہے۔ (جلد سوم ص۱۶۱)

یہ تو رہا مسلم قومیت کے متعلق۔ ان کی قیادت (لیڈر شپ) کے متعلق کہا:۔

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم ص۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم ص۷۰) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم ص۷۴)

مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف

اس کے بعد کہا:۔

اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں، ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ (جلد سوم ص۸۰)

مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے جواز بلکہ ضرورت کے لئے دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اس میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ اس حقیقت کو سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۷ء تک برابر دہرایا جاتا رہا لیکن مودودی (مرحوم) کا ارشاد یہ تھا کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی

تقریبًا میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے، ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔

(جلد سوم - ۱۳۲ - ۱۳۰)

جو کچھ مودودی (مرحوم) اس وقت کہتے تھے، اسے آپ نے سُن لیا۔ اس کے برعکس حقیقت کیا تھی اس کے متعلق ہم سے نہیں، خود مودودی صاحب کی زبان سے سنئے۔ انہوں نے ۱۹۷۶ء میں ایک بیان دیا تھا جو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۶ راگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

> اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز، پاکستان، ایک اسلامی حکومت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا ——— لا الٰہ الا اللہ ——— مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر، خود قائد اعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔

اس کے باوجود وہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کہتے تھے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔
>
> (جلد سوم صـ۹۳)

اس زمانے میں ان سے کہا گیا کہ چلئے! مسلمانوں میں ہزار نقص سہی۔ مسلم لیگ اور اس کی قیادت بھی آپ کے نزدیک اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے اس میں مطالبہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اگر یہ الگ خطۂ زمین مل گیا تو اس میں اسلامی مملکت قائم ہو جانے کا امکان تو ہوگا۔ آپ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیجئے گا۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اُس کی بنا پر میں اس

کو ناممکن سمجھتا ہوں ۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا ۔ (جلد سوم ۔ صفحہ ۱۶۸)

تاریخ پاکستان میں ۴۷-۱۹۴۵ کا زمانہ بڑا نازک تھا ۔ انگریز اور ہندو نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر ایک بار الیکشن پھر کرائے جائیں تو مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعوے کی قلعی کھل جائے گی ۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۴۶ء میں انتخابات کا فیصلہ کیا گیا ۔ ان انتخابات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قائداعظم (اپنی انتہائی خرابیٔ صحت کے باوجود) ملک بھر میں مسلسل دورے کر رہے تھے اور مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ یاد رکھو

اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم ناکام رہ جائیں گے بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا ۔ (۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو قوم کے نام خطاب)

اس وقت ایک ایک ووٹ فیصلہ کن حقیقت بن سکتا تھا ۔ ایسے نازک وقت میں مودودی (مرحوم) سے کہا گیا کہ وہ انتخابات میں مسلمانوں کا ساتھ دیں ۔ تو انہوں نے فرمایا کہ

ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو ، اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو ، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں ۔

(اخبار کوثر ، مورخہ ۸ ر اکتوبر ۱۹۴۵ء ۔ بحوالہ "مولانا مودودی ۔ دعاوی اور عمل" صفحہ)

آخری وقت تک مخالفت

مودودی (مرحوم) کی اس قدر شدید مخالفت کے باوجود قائداعظمؒ کو کامیابی حاصل ہوئی اور حکومت برطانیہ نے فروری ۱۹۴۷ء میں اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک ملک کو تقسیم کر دیا جائے گا ۔ اس پر مودودی صاحب نے سوچا کہ مسلم اکثریت کے صوبے ان کی مخالفت سے متاثر نہیں ہوئے تو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف اکسانا چاہئے ۔ اس مقصد کے لئے جماعت اسلامی کے وفود نے اقلیتی صوبوں کا رُخ کیا اور اپریل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ٹانک ، مدراس اور پٹنہ میں جماعت کے مخصوص اجلاس منعقد کئے ۔ ان میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے کیا کہا جاتا تھا ، اس کا اندازہ خود مودودی صاحب کی ایک تقریر سے لگائیے جو انہوں نے ۱۵ ر اپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں کی تھی ۔ اس میں انہوں نے کہا تھا :

ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے

سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (رودادِ جماعت اسلامی حصہ پنجم۔ صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۱۱۲)

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تحریک پاکستان کی بجائے اگر مسلمانانِ ہند اس دعوت کو قبول کر لیتے جو وہ دے رہے تھے:۔

تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا۔ اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے۔ (یاد رکھیے) جوں ہی ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دَور ختم ہو کر نیا دَور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ (ایضاً)

ان کے ایک اہم رفیق، ملک نصراللہ خان (مرحوم) نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسلام کے نفاذ اور اقامتِ دین کے لئے کسی خطۂ زمین کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ پٹھانکوٹ کے اجلاس میں انہوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا:۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سُن سُنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی اور سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خدا کے خوف سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایک ایسی مضبوط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریۂ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مرمٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریے کی حکومت قائم کرلے گی۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۵۴)

(ضمناً) مسلم اقلیتی صوبوں کو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کے لئے اکسانے کی اسکیم، مودودی (مرحوم) کی اپنی نہیں تھی۔ یہ درحقیقت (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی صدائے بازگشت تھی انہوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک بیان جاری کیا تھا جس میں پہلے کہا تھا کہ

مجھے اعتراف ہے کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری روح کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کرۂ ارض کے بعض حصے پاک ہیں اور باقی ناپاک۔ زمین کے مختلف خطوں کی "پاک اور ناپاک" کی یہ تقسیم یکسر غیر اسلامی اور اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام اس قسم کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ "خدا نے پورے کرۂ ارض کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے فرمایا :-

آئیے! ذرا جذبات سے ہٹ کر سوچیں کہ اگر پاکستان کی اسکیم عمل میں آگئی تو اس کے نتائج اور عواقب کیا ہوں گے۔ اس سے ہندوستان دو مملکتوں میں بٹ جائے گا ایک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور دوسری میں ہندو۔ ہندوستانی مملکت میں قریب ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو مختلف گوشوں میں اقلیت کی حیثیت سے بکھرے ہوں گے .... ان علاقوں میں انہوں نے ہزار سال سے اپنے ساکن تعمیر اور مسلّم ثقافت اور تہذیب کے مرکز قائم کئے تھے۔ وہ ایک صبح اٹھیں گے اور اپنے آپ کو ان علاقوں میں اجنبی اور حریف پائیں گے۔ وہ صنعت و حرفت، تعلیم اور معاشیات میں، (ہندوؤں سے) بہت پیچھے ہوں گے اور اپنے آپ کو اس مملکت کے رحم و کرم پر محسوس کریں گے جس میں اس وقت خالصۃً ہندو راج ہوگا۔[۱]

یہ تھا مخالفتوں کا وہ ہجوم جس کا مقابلہ، قائداعظمؒ کی جانِ ناتواں اکیلے کر رہی تھی۔ یہ سب اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے عزمِ راسخ کی بدولت تھا۔ سچ ہے۔

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جس شخص کو اپنے مسلک کی صداقت پر یقینِ محکم ہو، وہ اپنے اصولوں کے معاملہ میں کسی کے ساتھ کسی قسم کی سودے بازی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مقام پر چٹان کی طرح کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مصالحت یا مفاہمت کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بڑے سے بڑا لالچ یا مہیب سے مہیب خطرہ اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ دو ٹوک بات کرتا ہے جس میں نہ کسی قسم کا ابہام ہوتا ہے نہ التباس۔ وہ اپنا دعوےٰ صاف اور واضح الفاظ میں پیش کرتا ہے اور اس باب میں نہ کسی قسم کی مداہنت سے کام لیتا ہے نہ منافقت برتتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق ۔ یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

قائداعظمؒ کی زندگی اسی قسم کی ہم آہنگیٔ قلب و زبان کی مظہر تھی۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی تجویز پیش کی گئی تو قائداعظمؒ نے اس کی سختی کے ساتھ مخالفت کی

[۱] INDIA WINS FREEDOM . P.P. - 142 . 43

انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ اسکیم پروان چڑھ جائے۔ قائداعظمؒ کو منوا بنانے رہا یوں کیلئے کہ نہ دینے) کے لئے برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اس نے سمجھا کہ ایک صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اتنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیر اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر وہ بڑا متعجب ہوا اور الوداعی الفاظ کہتے کے ساتھ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہوا؟ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت کیساتھ کہا کہ

"اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں"۔

لارڈ لنلتھگو اپنے رعب و داب کیلئے بڑا مشہور تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اس نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں سے کہا کہ وہ وار کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے کا وقت مقرر تھا۔ لیکن قائداعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسرائیگل لاج نہ پہنچے ـــــ یہ اس لئے کہ وائسرائے کو معلوم ہو جائے کہ اس کی یہ حرکت قائداعظمؒ کے لئے کس قدر بجا طور پر خفگی کا موجب ہوئی ہے۔ وہاں جا کر قائداعظمؒ نے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں، کمرے سے باہر نکل آئے۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر مسٹر دوارکا داس کانجی نے لکھا تھا۔

> یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناح کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بیباکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جب کہ باقی ہندوستانی لیڈر۔ جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو بہترین انگلش جنٹلمین اور بہترین عیسائی جنٹلمین جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کرتے تھے۔

یہ اس لئے کہ ایک اصول پرست انسان کے دل میں مصلحت آمیزی کا خیال تک نہیں آ سکتا جو وہ منافقت کا انداز اختیار کرے۔ مروجہ الفاظ میں یوں کہئے کہ قائداعظمؒ کے لغت میں "نظریۂ ضرورت" جیسے الفاظ ملتے ہی نہیں۔ اقبالؒ نے کس قدر سچ کہا ہے کہ

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل ۔۔۔ عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

قائداعظمؒ کا اپنے مشن کے ساتھ عشق، نہایت پختہ تھا اس لئے اس میں مصلحت کوشی کا شائبہ تک بھی بار نہیں

پاسکتا تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا

انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست میں حصولِ مقصد کے لئے ہر حربہ بھی استعمال کیا جائے جائز قرار پاتا ہے۔ لیکن قائداعظمؒ کے نزدیک سیاست میں اس قسم کی روش کس قدر قابلِ مذمت تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے جسے مرزا اصفہانی نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔

کلکتہ کے مسلم حلقۂ کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلامقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخ نامزدگی سے دو دن پہلے، بالکل خلافِ توقع ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کرنا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریقِ مقابل کا یوں سامنے آ جانا وجہ پریشانی ہو گئی۔ ایک شام (مرحوم) عبدالرحمٰن صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرِ ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائداعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائداعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ

تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریقِ مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور کیا ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا:۔

میرے عزیز! یاد رکھو۔ پبلک لائف میں اخلاق دیانت، پرائیویٹ لائف سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔ (پرائیویٹ لائف میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے لیکن) پبلک لائف میں بددیانتی سے لاتعداد انسان مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزار! ایسے لوگ بے راہ رو ہو جاتے ہیں، جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ سرمایہ داروں، جاگیرداروں۔ وڈیروں کی جماعت تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ مسلم لیگ کے ساتھ تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قائداعظمؒ نے ان لوگوں کو ساتھ رکھنے کیلئے اپنے

انھوں میں کوئی لچک پیدا کر لی تھی یا ان سے کچھ سمجھوتے دعوے کر رکھے تھے، قطعاً نہیں۔ انھوں نے انہیں وارن کر دیا تھا کہ پاکستان میں نظامِ سرمایہ داری قطعاً بار نہیں پا سکے گا۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (دہلی) کے سیشن میں اعلان کیا تھا کہ

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی زد سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ایسے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا؛ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے

دوسری طرف انھوں نے قوم کو اس سے بھی متنبہ کر دیا کہ جس طرح نظامِ سرمایہ داری خلافِ اسلام ہے اسی طرح کمیونزم کا نظام بھی قرآن کے خلاف ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اب کچھ دنوں سے ایک پارٹی بہت متحرک ہو گئی ہے۔ وہ ہے کمیونسٹ۔ ان کا پراپیگنڈہ بڑا پُرفریب ہے اور میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ ان کا پراپیگنڈہ دامِ ہمرنگِ زمیں ہے۔ ایک خطرناک پھندا ہے۔ وہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنل سوشلزم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو! ہمارے ہاں ان "ازموں" یا اس قسم کی کسی اور ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ (تقاریرِ جناحؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۳)

پھر انھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس منعقدہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء کے آخری اجلاس میں فرمایا:-

یہ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں۔ ان کے اس قسم کے مغالطہ میں رہنے کے لئے کچھ وجہ جواز ضرور ہے لیکن (یہ قصۂ ماضی ہے)، گزشتہ پانچ دس سال میں مسلمانوں میں ایسی تبدیلی آ چکی ہے کہ کمیونسٹ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر انہوں نے پھر سے وہی کھیل کھیلنا چاہا تو انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا جائے گا (جسے وہ یاد رکھیں گے)۔ ہم مسلم لیگ کے ہلال اور ستارہ کے پرچم کے سوا کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہمارا رہنما بھی ہے اور مکمل ضابطۂ حیات بھی۔

> ہم کوئی زرد یا سُرخ جھنڈا نہیں چاہتے۔ ہم کوئی ازم بھی نہیں چاہتے۔
> (بحوالہ، نوائے وقت، مورخہ ۲۳ر اپریل ۱۹۷۰ء)

قائداعظمؒ کے ذوقِ یقین، حسنِ تدبر، دیانتدارانہ سیاست اور عزم راسخ کی بدولت وہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا جس میں قرآنی نظامِ مملکت قائم کیا جانا مقصود تھا۔ اس سے ان مذہبی جماعتوں نے جنہوں نے اس کی آخر تک مخالفت کی تھی ہمت نہ ہاری۔ وہ ہجوم کر کے ادھر آگئیں۔ انہوں نے یہاں آکر یہ اسکیم مرتب کی کہ یہ خطۂ زمین تو حاصل ہو گیا ہے لیکن اس میں وہ نظام قائم نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا ہے۔ قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان کے بعد اعلان کیا تھا کہ کچھ بھی ہو:۔

> یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔
> (تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل - صـ۶۵)

قائداعظمؒ ان مخالف قوتوں کو یہ چیلنج دے کر دنیا سے تشریف لے گئے اور انہوں نے میدان خالی پا کر اپنی اسکیم کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔

یہ حضرات اپنی اسکیم کو اس دریا کی پر سکوت روانیوں کی طرح آگے بڑھاتے رہے جو سطح پر تو بالکل بے خطر نظر آئے لیکن جس کی تہ میں بڑے بڑے مہیب اژدر اور خوفناک نہنگ چھپے بیٹھے ہوں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ پاکستان کا ضابطہ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے۔ انہوں نے یہ ریزولیوشن یہ جانتے ہوئے پاس کیا کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ بیس برس تک اس ناممکن العمل مطالبہ کا شور مچانے کے بعد اگست ۱۹۷۰ء میں خود مودودی (مرحوم) نے یہ اعلان کر دیا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں قانون سازی کی صورت کیا ہو؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے ——— وہ فقہ جس کے متعلق ان کا اپنا ارشاد تھا کہ اس نے اسلام کو "منجمد شاستر" بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ "منجمد شاستر" زمانے کے ... بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لئے اس فقہ کے قوانین پر عمل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہہ کر چلے گئے اور ملک کی کشتی کو ایسے گرداب میں پھنسا گئے جس سے نکلنا اس کے بس میں نظر نہیں آتا۔

جس اسلام کو نافذ کرنے کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا اس کے سامنے تو دنیا کی کوئی ازم بھی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ لیکن جو اسلام تھیاکریسی یہاں نافذ کر رہی ہے، اس سے ہماری نوجوان نسل دل برداشتہ ہی نہیں، برگشتہ ہو رہی ہے۔ یہ جو آئے دن پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ہماری نئی نسل اسلام کے بہت قریب آ رہی ہے، یہ ابلہ فریبی نہیں تو خوش فہمی ضرور ہے۔ یہ نسل اسلام سے (یعنی اس اسلام سے جسے تھیاکریسی یہاں رائج کر رہی ہے) متنفر ہی نہیں، سرکش ہو رہی ہے۔ مذہب

سے نفرت اور سرکشی، کمیونزم کے لئے راستہ ہموار کر دیتی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ مروجہ اسلام سے برگشتہ ہو کر کمیونزم کے آغوش میں نہ چلا جائے۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کے لئے یہ پناہ بڑی پرکشش خوش آئند ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اندیشہ جو ہماری روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تھیاکریسی کا آخری ردِّ عمل لادینی ہوتا ہے۔ خود ہماری تاریخ میں، دورِ ملوکیت کی، تھیاکریسی نے ہلاکو خان کو آواز دی تھی۔ ڈر ہے کہ دورِ حاضر کی ہماری تھیاکریسی روسی آہن کے لئے مقناطیس ثابت نہ ہو جائے۔ حکیم الامت کی نگہ دُور رس نے شاید اسی خطرہ کو بھانپ کر کہا تھا کہ ؎

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ہنگامہ چنگیزے (پیامِ مشرق ص ۱۵۲)

خدا کرے کہ ہماری یہ کشتِ آرزو جو اس مردِ درویش کے پاکیزہ آنسوؤں اور اس صاحبِ عزمِ عظیم کی مجاہدانہ گرم جوشیوں سے پروان چڑھی تھی، اس بادِ سموم کی شعلہ باریوں سے محفوظ رہے۔ لیکن قرائن بتلا رہے ہیں کہ ہماری یہ دعائیں، تھیاکریسی کی آوردہ اور پروردہ بلاؤں کی حریف شاید ہی ہو سکیں! جب جھکڑ چلتا اور سیلاب امنڈتا ہے تو وہ دیر و حرم میں تمیز نہیں کیا کرتا۔ اسی لئے قرآن نے کہا تھا۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۲۵)

اس فتنہ سے محتاط رہو جو (جب اٹھتا ہے تو) انہی تک محدود نہیں رہتا جنھوں نے ظلم کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ (وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے)۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کا مواخذہ بڑا سخت ہوتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف (ضربِ کلیم ص ۱۵۸)

ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ تھیاکریسی۔ ملت کے وہ گناہ ہیں، جو کبھی معاف نہیں ہو سکتے۔ یہ گناہ قوموں کو لے ڈوبتے ہیں۔ اور جب قوم ڈوب جائے تو افراد کیسے بچ سکتے ہیں؟

نظریۂ ضرورت کے عملی نتائج

ہم نے طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۸۳ء کے اداریہ (لمعات) میں "نظریۂ ضرورت" کے متعلق مختصر سی بحث کی تھی۔ معاصر نوائے وقت (لاہور) نے اس اداریہ کو اپنی ۱۷ فروری کی اشاعت میں ہماری اجازت بلکہ علم کے بغیر مقالہ کے طور پر شائع کیا۔ اس میں کہیں طلوعِ اسلام کا حوالہ نہیں دیا، اور از خود "تحریر۔ غلام احمد پرویز" کے الفاظ ثبت کر دیئے اور اس میں کانٹ چھانٹ بھی کی۔ ہم نے ان کی خدمت میں گزارش کیا کہ ان کا یہ اقدام آدابِ صحافت اور ضابطہ اخلاق کے خلاف ہے۔ ان کی طرف سے ہمارے خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بہرحال یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ یہ اسی "نظریۂ ضرورت" کا نتیجہ ہے جو آج کل ہمارے ملک (بلکہ ساری دنیا) میں وبائی مرض کی طرح پھیلا ہوا ہے اور اسے اسلامی ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ہم نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا کہ ہمارے ہاں اس نظریہ کی ابتدا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے کی تھی جب انھوں نے کہا تھا کہ عملی زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور بہ تقاضائے مصلحت بنیادی اصولوں تک کو بھی توڑا جا سکتا ہے۔ روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲ مارچ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں عاصم نعمانی صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہوا ہے جس میں انھوں نے مودودی (مرحوم) کی مدافعت کی ہے اور (چونکہ ان کا مقالہ نوائے وقت کے حوالے سے لکھا گیا ہے اس لئے) انہیں حسبِ عادت، پرویز صاحب کو ہدفِ طعن و تشنیع بنانے کا بھی موقعہ مل گیا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے :-

> اپنے مضمون میں پرویز صاحب نے مولانا مودودی مرحوم کا ایک مزید حوالہ بھی دیا ہے اور ایک ادھورا اقتباس درج کرکے علمی دیانت کا منہ چڑایا ہے۔ اقتباس یہ ہے :-
>
> "راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔" (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

اس اقتباس میں مولانا مودودی مرحوم نے "عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں" کا ذکر کیا ہے۔ آگے بطور مثال تین ضرورتوں کا ذکر کیا ہے۔ میں وہ پوری عبارت درج کر کے فیصلہ قارئین پہ چھوڑتا ہوں کہ آیا بیان کردہ ان صورتوں میں آدمی کو سچ بولنا چاہئے یا جھوٹ بول کر مطلب برآری کر لینی چاہئے۔

پرویز صاحب کا درج کردہ اقتباس اس فقرے پر ختم ہوتا ہے کہ "اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔" اس سے آگے مسلسل عبارت چل رہی ہے جو اس طرح ہے:-

(۱) صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لئے اگر صرف صداقت کو چھپانے سے کام نہ چل سکتا ہو تو ضرورت کی حد تک جھوٹ سے کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔

(۲) جنگ کی ضروریات کے لئے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں ہے بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کو بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو اور وہ غریب کہیں چھپا ہوا ہو تو سچ بول کر اس کے چھپنے کی جگہ بتا دینا گناہ اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا واجب ہے۔

یہ ہے مولانا مودودی مرحوم کی پوری عبارت۔ اس میں جو تین صورتیں بطور مثال پیش کی گئی ہیں آگے احادیث اور دیگر مستند کتب سے اس کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیمات حصہ سوم صفحہ ۷۰ تا ۸۱۔

اس کے بعد نعمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

مگر جناب پرویز صاحب نے مولانا مودودی مرحوم کی بات سیاق و سباق سے کاٹ کر علمی خیانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے اختلاف کیا جا رہا ہے اس کے نظریے اور مکمل خیالات بیان کر کے اختلاف کیا جائے۔ مودودی صاحب مرحوم نے جو بات کہی ہے اور جس کے لئے تین مثالیں بھی بیان کی ہیں اور آگے مزید ان تینوں کے حق میں صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین سے دلائل مع حوالہ جات درج کر دیئے ہیں۔

نعمانی صاحب نے جس بات کو علمی خیانت اور بددیانتی سے تعبیر کیا ہے، ذرا اس کی حقیقت پر غور کیجئے۔ مودودی مرحوم نے اپنے اس دعوے کو (کہ عملی زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے) بطور کلیہ بیان کیا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے "تین ضرورتیں" بطور مثال بیان کی ہیں۔ اگر مودودی صاحب اپنے دعوے کو ان تین صورتوں تک محدود رکھتے۔ (یعنی وہ کہتے کہ صرف ان تین ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی ایسی صورت نہیں جس کے لئے جھوٹ بولا جا سکتا ہے) تو پھر تو کہا جا سکتا تھا کہ مودودی صاحب کے بیان کے اس حصہ کو حذف کرنا علمی خیانت ہے۔ بحث مودودی صاحب کے مذکورہ بالا کلیہ سے متعلق تھی نہ کہ ان کی پیش کردہ مثالوں سے متعلق۔ اس کلیہ کے تحت سینکڑوں مثالیں اور بھی ہو سکتی ہیں جن پہ اس کلیہ کا انطباق ہوتا

چلا جائے ۔ خود مودودی مرحوم نے انہی مثالوں کے تسلسل میں ایک اور مثال دی ہے جو ان تین مثالوں میں سے کسی کے تحت نہیں آتی ۔ کہتے ہیں :-

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا ۔ تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں ۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی ۔ (ترجمان القرآن ۔ مئی ۱۹۵۵ء ، صفحہ ۹۵) ۔

ظاہر ہے کہ کعب بن اشرف کا قتل نہ اصلاح بین الناس کے ضمن میں آتا ہے ۔ نہ ازدواجی زندگی سے اس کا کچھ تعلق تھا ۔ اور نہ ہی یہ جنگ کی ضرورت تھی ۔ اور آگے بڑھئے ۔ لکھتے ہیں :-

حجاج بن علاط نے غزوۂ خیبر کے موقع پر مکہ والوں کے قبضہ سے اپنا مال نکال کر لے آنے کے لئے جھوٹ سے کام لینے کی اجازت مانگی اور حضورؐ نے ان کو بھی اس کی اجازت فرمائی ۔ (ایضاً)

فرمائیے ! یہ ان تین ضرورتوں میں سے کس ضرورت کے تابع آتا ہے ؟

نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ مودودی مرحوم نے اپنے دعوے کی تائید میں احادیث درج فرمائی تھیں ۔ مودودی صاحب کی درج کردہ ایک[1] حدیث میں کہا گیا ہے :-

اسماء بنت یزید ، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتی ہیں ۔ کہ جھوٹ جائز نہیں مگر تین چیزوں میں ۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اس کو راضی کرے ۔ جنگ اور اسی طرح بین الناس (ایضاً)

اس حدیث کی رُو سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ان تین صورتوں کے علاوہ کسی اور صورت میں جھوٹ جائز نہیں ۔ لیکن مودودی صاحب نے کلیہ وہ قائم کر دیا جس کی رو سے زندگی کی جس عملی ضرورت کے لئے چاہے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں ، واجب ہو جاتا ہے ۔

باقی رہے "سلف صالحین" تو مودودی صاحب نے علامہ نووی کی کتاب ریاض الصالحین سے یہ اصول نقل فرمایا ہے :-

ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے ۔ لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے ۔ پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو کہ اس کا حاصل کرنا مباح ہو تو اس کے لئے جھوٹ بھی مباح ہے ۔ اور اگر اس کا حصول واجب ہو تو اس کے لئے جھوٹ بھی واجب ہے ۔ (ایضاً صفحہ ۵۵)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں :-

غور سے دیکھا جائے تو یہاں بھی وہی قاعدہ کارفرما نظر آتا ہے کہ سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کرنے کی ایک اخلاقی قیمت ہے[2] جس سے زیادہ قیمتی چیز کا نقصان ہو رہا ہو تو اس سے نسبتاً

---

[1] ہم ان تمام روایات کو وضعی سمجھتے ہیں ۔ حضورؐ کی اس قسم کی تعلیم ہو نہیں سکتی ۔

[2] یعنی یہ احکام خداوندی نہیں ۔ ان کی صرف اخلاقی قیمت ہے !

کم قیمت چیز کا نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں گوارا کرنا چاہئے۔ (ایضاً)

یہ تھے مودودی صاحب کے وہ عقائد اور نظریات جنہیں دیکھ کر ان کے بعض سربرآوردہ اور ممتاز رفقا (مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن وغیرہ) نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان میں سے بیشتر حضرات (بالخصوص مولانا کوثر نیازی۔ ڈاکٹر اسرار احمد۔ حکیم عبدالرحیم اشرف) نے اس زمانے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا کہ خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے ارکان مودودی صاحب کے ان نظریات پر کس طرح عمل کرتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو اس پورے کے پورے لٹریچر کو شائع کر دیں لیکن اس کے لئے نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ اس سلسلہ میں دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے جریدہ المنبر (جو اب المنبر کے نام سے شائع ہوتا ہے) کی اشاعت بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ

میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ۱۷ ستمبر ۱۹۵۴ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دوسرے امور کے "منکرینِ سنت" کے فتنہ اور ان کی کوششوں کا بھی ذکر آیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعت لٹریچر کی ایک اسکیم بتلائی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب سے ملیں کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور وہاں کسی شخص کی "تالیفِ قلب"[1] کر کے اس سے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔ اور یہ لٹریچر ان پتوں پر مفت ارسال کیا جائے۔

میں نے چوہدری صاحب موصوف سے مولانا کی اس تجویز کا ذکر کیا تو انہوں نے اس انداز سے اس پر تعصیب کا اظہار کیا کہ یہ بات اس سے پہلے بھی ان تک پہنچ چکی ہے —— اب یہ بات چوہدری صاحب کے علم میں ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس پر عمل بھی کیا ہے یا نہیں۔ بعض واقعات سے میرا گمان ہے کہ یہ پتے حاصل کئے گئے ہیں۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۲)

اس کے بعد حکیم اشرف صاحب نے لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے "مؤلفۃ القلوب" کی جو تفسیر اپنی کتاب تفہیم القرآن میں درج کی ہے اس سے بھی ان کی اسی ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے۔

(ضمناً) چوہدری غلام محمد (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) نے پرویز صاحب کے خلاف یہ جھوٹا الزام عائد کیا تھا کہ انہیں مرکزی حکومت نے ایک لاکھ روپیہ کی امداد دینی منظور کی ہے جس میں سے بیس ہزار مل چکی اور باقی ملنی ہے۔ چوہدری صاحب سے (بذریعہ رجسٹرڈ خط) کہا گیا کہ وہ اپنے اس الزام کا ثبوت پیش کریں لیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بالکل چپ سادھ گئے۔

یہی نہیں۔ یہ حضرات تیس پینتیس سال سے یہ پراپیگنڈا کرتے چلے آ رہے ہیں کہ پرویز صاحب اور طلوع اسلام تین وقت کی نمازوں اور نو دنوں کے روزوں کے قائل ہیں۔ یہ الزام بھی کہ پرویز صاحب

---

[1] یعنی رشوت دے کر۔

نے ملک غلام محمد (گورنر جنرل۔ مرحوم) کو مرکزِ ملت قرار دیا اور انہیں خلفائے راشدینؓ کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

طلوعِ اسلام میں سینکڑوں مرتبہ اعلان کیا گیا کہ یہ تمام الزامات وضع کردہ اور جھوٹے ہیں۔ بارہا بار ان سے کہا گیا کہ جو الزامات آپ تراشتے ہیں ان کے ثبوت میں طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کی ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں میں سے ایک فقرہ بھی نکال کر دکھا دیں لیکن انہوں نے کسی ایک بات کا جواب نہ دیا اور اپنے پراپیگنڈہ کو بدستور جاری رکھا۔ اور اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے جھوٹ بولنا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس قسم کے کسی کے نظریات ہوں اسی قسم کا اس کا کیریکٹر ہو جاتا ہے۔

ماہنامہ میثاق کی اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں (جو اس زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر سرپرستی، اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا) یہ واقعہ درج تھا:۔

> (جماعت اسلامی کی) مجلس شوریٰ کے ایک بزرگ ترین رکن کا ایک بیان ہے جس سے مودودی صاحب کے قائم کردہ نظریہ حکمت عملی کی حقیقت پر بڑی اچھی روشنی پڑ سکتی ہے کہ جب ملک میں مرزائیوں کے خلاف تحریکِ ختمِ نبوت کا آغاز ہوا تو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس تحریک میں عملاً کوئی حصہ نہ لے۔ لیکن جب جماعت کے حلقہ جاتی امراء کا اجتماع منعقد ہوا تو جماعت کے امیر جناب مودودی صاحب نے ان کو ہدایات دیں کہ اب جتنی بھی آگ بھڑکائی جا سکتی ہے بھڑکاؤ۔ اس پر اس بزرگ رکن شوریٰ نے اعتراض کیا کہ یہ ہدایات مجلس شوریٰ کے فیصلے کے قطعی خلاف ہیں تو انہیں حکماً خاموش کرا دیا گیا۔ اور پھر جب تحقیقاتی عدالت کے سامنے مودودی صاحب نے اپنا بیان دیا تو اس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ جماعت نے عملاً اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ ہے نظریہ حکمتِ عملی کی ایک عملی مثال جس کے شاہد ایک سابق بزرگ ترین رکن شوریٰ ہیں۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام ۔ نومبر ۱۹۶۶ء ۔ صـ ۲۴)۔

(۲)

جب مودودی صاحب کے رفقاء نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ آپ نے تحریک کے آغاز میں جو بلند و بالا اصول پیش کئے تھے اب آپ انہیں ترک کئے جا رہے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ یہ بھی اسلام کی تعلیم اور سنت نبویؐ کے عین مطابق ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس کا کس طرح مواخذہ کیا تھا اسے رہنے دیجئے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے ان کے اس نظریہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا ہم اسے پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اپنے نظریہ کو ترجمان القرآن کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے جریدہ المنبر کی ۳۱ جنوری ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں اس کے خلاف ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے اس امر کی وضاحت کی کہ مودودی صاحب نے جو دین کو ایک تحریک سے تعبیر کیا تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اب مودودی صاحب کی طرف سے

اس قسم کی آوازیں سُنائی دینا شروع ہو گئی ہیں کہ[1]

"ہمارا اپنا نظریہ ہے کہ ہم اپنی تحریک کو خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں اگر ہمارا مقصد محض "اعلانِ حق" ہوتا تو ہم ضرور بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لئے اسی واقعات کی دُنیا میں سے راستہ نکالنا ہے۔ اس لئے ہمیں نظریت (IDEALISM) اور حکمت عملی (PRACTICAL WISDOM) کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے"۔ (ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۱)

اس مقام پر تو یہی کہا گیا تھا کہ

(الف) اعلانِ حق اور قیامِ حق دو مختلف چیزیں ہیں۔

(ب) اگر صرف اعلانِ حق ہی مقصود ہو تو صرف "بے لاگ حق" بات کہنے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے لیکن

(ج) چونکہ مقصد "حق کو قائم کرنا" بھی ہے اس لئے نظریت (IDEALISM) کام نہیں دے سکتی۔

(د) بلکہ ضروری ہوگا کہ نظریت اور حکمت عملی کے درمیان "توازن" کو برقرار رکھا جائے۔

بات اگرچہ اصحاب نظر کی تشویش کو واقعہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھی لیکن مجمل ہونے کے باعث ایسی نہ تھی کہ اسے سب کے لئے خطرے کے الارم کی حیثیت دی جا سکے۔ مگر وضاحت کا دوسرا مرحلہ آیا تو یہ آواز ذرا پھیلی اور سُنائی دیا جانے لگا:-

جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لئے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجودہ مزاحمتوں کو ہٹانے کے لئے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ حکمت عملی ناگزیر ہے اس حکمت عملی کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے کیونکہ یا تو وہ قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہو سکتی ہے اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں اور کون سی بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے؟ (ایضاً صفحہ ۱۲)

یعنی ایک قدم آگے بڑھے کہ جس کے کندھوں پر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری بھی ہو اسے حالات و کوائف کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ

"کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے"؟

---

[1] یہ بحث طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۵۵ء میں پوری تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

پہلے مرحلہ پر نظریت اور حکمت عملی میں "توازن" کو برقرار رکھنے کا اصول بیان ہوا تھا اور اب اس توازن کی عملی شکل یہ سامنے آئی کہ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنے والے قافلے کے قائد کو یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ کس بات کو قبول کرے اور کسے رد کرے۔ اب تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ

(الف) آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور

(ب) جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی یعنی "واقعات کی دنیا" میں جس طرح یہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل پر ہی نظریں گاڑے رہے اور کسی دوسری چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی سے جما رہے۔ بلکہ

"جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل پر ہی رکھوں گا اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لئے کوئی کام نہیں کرسکتا۔"

مزید وضاحت :-

"جہاں (واقعات کی دنیا میں) آئیڈیلزم کے ساتھ پیرامر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہئے کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہئے۔

اور

کن (اصولوں) میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنی چاہئے۔" (ایضاً۔ صـ۳)

دو باتیں واضح ہوئیں :-

ایک تو یہ کہ آئیڈیلزم اور حکمت عملی دونوں میں سے فیصلہ کی باگ ڈور حکمت عملی (PRACTICAL WISDOM) کے ہاتھ میں ہے (وہی یہ طے کرتی ہے کہ .....)

دوسرے یہ کہ

(حکمت عملی ہی یہ طے کرے گی کہ) اقامت دین کی علمبردار جماعت جن اصولوں کو پیش کرتی رہی ہے ان میں سے کون سے اصول ایسے ہیں جن میں "لچک" پیدا نہیں ہو سکتی اور کون سے اصول ایسے ہیں جن میں "اہم تر مصالح" اور "ضرورت" کی خاطر لچک کی "گنجائش" نکالنی چاہئے۔"

چوتھا مرحلہ

(حضورؐ کے اسوہ سے اصولوں میں لچک پیدا کرنے بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کی ایک مثال پیش کرنے کے بعد وضاحت ہوتی ہے) "یہ (مثال) اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔ حکمت عملی ہی نہیں حکمت دین کے بھی خلاف ہے۔" (ایضاً۔ صـ۲۲)۔

آخری حد ـــــــ

مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے ۔

مراد یہ ہے کہ

ایک طرف دین کے "بعض اصول" ہوں اور دوسری جانب بعض "دینی مقاصد" ہوں اور دین کے ان بعض اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے ان "بعض دینی مقاصد" کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو "حکمت عملی" ہی نہیں "حکمت دین" کا تقاضا یہ ہے کہ ان "بعض" دینی اصولوں" پر عمل کرنے پر" اصرار" نہ کیا جائے ـــــ اگر ایسا اصرار کیا گیا تو یہ حکمت عملی ہی کی خلاف ورزی نہیں ہوگی "حکمت دین" کی مخالفت بھی ہوگی ۔ اور جس شخص کو اسلامی تحریک لے کر چلنا ہے اور جو صرف اعلان حق پر ہی اکتفا کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ مقصد بھی اپنے سامنے رکھتا ہے کہ دین کو قائم بھی کیا جائے ۔ ایسے شخص کو یہ حق حاصل ہے ـــــ نہیں اس پر "اقامت دین" ہی کی جانب سے یہ فرض عائد ہوتا ہے ـــــ کہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ دین کے کون سے اصول ایسے ہیں جن میں کسی مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے لچک پیدا نہیں کی جا سکتی اور کون سے اصول وہ ہیں جن میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے

اور

اس بات کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ جن اصولوں میں لچک پیدا نہیں کی جا سکتی وہ ہیں اساسات دین کے اصول یعنی توحید و رسالت وغیرہ (یعنی ایمانیات) ان میں استثنے، لچک اور ان کی خلاف ورزی کی کوئی مثال آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں نہیں ملتی ۔ البتہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے اس بات کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے جو اصول اسلامی نظام کے پیش فرمائے تھے جب عملاً اسلامی نظام کو قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو حضورؐ نے ان اصولوں میں لچک پیدا کی [1]

مثلاً

"اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے ۔

اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی ۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش امام قریش ہی میں سے ہوں ۔

---

[1] معاذ اللہ ۔ (طلوعِ اسلام)

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے اصول میں اتنے بڑے استثنا کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو درکنار کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی اس لئے حضورؐ نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا کیونکہ اگر عرب ہی میں حضورؐ کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامتِ دین کے فریضہ کو کون انجام دیتا؟" (ایضاً صـ۳۴)

چند لمحات کے لیے الائمۃ من قریش کی حدیث پر بحث[1] تو ملتوی کیجئے اور اس فکر و فلسفہ کا تجزیہ کیجئے جو تحریک اقامتِ دین کے نام سے سید المرسلؐ کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے

صورتِ واقعہ یوں بنتی ہے کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک جاری فرمائی اور اس کے چند اصول بیان فرمائے ان اصولوں میں بعض تو وہ تھے جن کا تعلق ایمانیات سے تھا مثلاً ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت وغیرہ۔ کفارِ مکہ نے بارہا مطالبہ کیا کہ حضورؐ! ان اصولوں میں نرمی اور لچک پیدا کیجئے تو ہم آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں ــــ آپؐ نے فرمایا اگر میرے داہنے ہاتھ پہ سورج رکھ دو اور بائیں ہاتھ میں چاند تھما دو اور مطالبہ کرو کہ توحید وغیرہ عقائد میں کوئی لچک پیدا کروں تو یہ ممکن نہیں ــــ چنانچہ حضورؐ کی پوری زندگی میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ان اصولوں میں لچک اور استثنا پیدا کرنے کا ثبوت پیش کیا جا سکے۔

ان کے ساتھ ایک دوسری قسم کے اصول بھی آنحضورؐ نے پیش فرمائے مثلاً

جو اسلامی نظام میں قائم کروں گا اس میں ہر اسود و ابیض اور عربی و عجمی کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔

سب کی جان مال اور عزت و آبرو کی آزادی حاصل ہوگی جو شخص اس نظام کو قبول کریگا اسے امن کی ضمانت دی جائیگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لوگوں نے اس دعوت کو سنا ان اصولوں کو اپنے لئے مفید محسوس کیا پھر فارس، روم، ایران اور عرب دنیا کے تمام خطوں سے لوگ آئے اور انہوں نے اپنی خدمات اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لیے پیش کر دیں۔

اسلامی نظام کی اس "محمدی تحریک" کو جدید ترین کش مکش سے واسطہ پڑا۔ بیسیوں لڑائیاں اس کے لئے لڑی گئیں۔ ہزاروں کارکن ان لڑائیوں میں شہید ہوگئے ــــ اور بالآخر وہ لمحہ آیا کہ یہ نظام عملاً قائم ہوا۔

اس مرحلہ پر قائد تحریک (محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی تحریک کے آغاز میں لوگوں کے سامنے جو آئیڈیل (IDEAL) پیش فرمایا تھا اس کے ان اصولوں کو جو اول الذکر قسم (ایمانیات) کے اصولوں سے الگ تھے

---

[1] اس حدیث پر اسی اشاعت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک اہم اور جامع مقالہ دیا جا رہا ہے جو توقع ہے کہ وضاحت مدعا کے لئے کافی ہوگا۔ (انجم)

- یہی وہ مقامات ہیں جہاں طلوع اسلام کہا کرتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ نبی اکرمؐ کی ہے ہی نہیں۔ حضورؐ کی طرف غلط منسوب ہے۔ اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔

(مثلاً مساوات تمام کو خلیفہ بننے کا حق دیا جاتا اور سب کو شخصی آزادی اور جان و مال کی عصمت کی حفاظت کی ضمانت وغیرہ) ان کے بارے میں یہ طے فرمایا کہ ان میں سے جو اصول حکمت عملی (PRACTICAL WISDOM) سے متصادم ہوں گے یعنی جن پر عمل پیرا ہونے سے "اقامت دین" کی تحریک کو نقصان پہنچے گا ان میں استثنے اور لچک پیدا کر لی جائے گی۔

چنانچہ حضورؐ کی زندگی میں ایسی "بے شمار مثالیں" ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب پوری مملکت میں اسلامی خلافت قائم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے اسلامی مساوات پر عمل کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا" اور حکم صادر فرمایا کہ دیکھنا کہیں تمام مجیبوں اور سب کو یہ موقعہ دے دینا کہ جس کو پسند کرو خلیفہ منتخب کر لو — اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تحریک میرے بعد فوراً ہی ختم ہو جائے گی۔ بلکہ تم ایسا کرو کہ اسلامی مساوات کے اصول میں ایک اہم "استثنے" پیدا کرو — نہیں میں خود اپنے پیش کردہ اس اصول میں ایک اہم استثنا پیدا کرتا ہوں اور تمہیں نظام اسلامی کی تحریک کے دوران پیش کئے گئے اس اصول مساوات پر عمل کرنے سے روکتا ہوں - اب تم ایسا کرنا کہ خلیفہ صرف قریش میں سے منتخب کرنا۔

غور فرمائیے — اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا — اور اگر "اسلامی تحریک" اس اسوہ حسنہ کے مطابق اسی طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامت دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ

اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثنے پیدا کرے اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو۔ اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مبینہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حق خلافت ایسے اہم اصول اور ضمانت پر عمل کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا) تو اس اسلامی تحریک اور اس اقامت دین کی جدوجہد — اور ان طالع آزما سیاستدانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصول اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں، بہت سے حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں لیکن جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو کہ وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔"

"پھر اس پہ بھی غور کیجئے کہ اگر یہ دروازہ یوں کھلتا ہے کہ اسلامی نظام کی تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ اسلام کے اساسی معتقدات کے علاوہ دوسرے اصولوں میں لچک پیدا کرے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج اس نے حکمت عملی کو معیار قرار دے کر یہ طے کیا کہ مساوات کے اصول پر عمل ممکن نہیں اور اس پر عمل کرنے سے اسلامی تحریک کو نقصان پہنچے گا اس لئے مساوات کے اصول پر ایک پابندی عائد کر دو۔ کل وہ یہ محسوس کرے کہ اب کشمکش احوال متقاضی ہے کہ شخصی آزادی کے حصول پر بھی پابندیاں عائد کی جائیں لہٰذا اسے محدود کر دیا جائے۔ پرسوں اس کی رائے یہ ہے کہ اس وقت جمہوریت اسلامی مملکت اسلامی نظام کے لئے راس نہیں آتی اور اگر اس پہ عمل کیا گیا تو اقامت دین کی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا اب محدود جمہوریت CONTROLLED DEMOCRACY رائج ہونی چاہئے۔ اور پرسوں اسے یہ محسوس ہو کہ اب دستوری نظم کا چلانا اسلامی تحریک کے لئے مفید نہیں لہٰذا اب دستور کو معطل کر کے صدر راج یا اس سے آگے بڑھ کر مارشل لاء نافذ کرنا چاہئے اور وہ اسے "حکمت دین" قرار دے کر ان لوگوں

کو مصلحتِ دین کے مخالف قرار دے جو اسلامی نظام کے اصولِ جمہوریت پر عمل کرنے پر "اصرار" کریں۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار مفسدے صرف اس فلسفہ کو قبول کر لینے سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو اصول اقامتِ دین کی تحریک کے اول دور میں پیش کئے جائیں جب عملاً دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آئے تو جس شخص کو اس قافلہ کو لے کر چلنا ہو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ نظریت کے ساتھ حکمتِ عملی کو متوازن کرے اور پیش آمدہ موانع کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام کے اصولوں میں سے جس کو ضروری خیال کرے قبول کرے اور جسے مضر خیال کرے اسے رَد کر دے۔

اور یہ مفسدہ دین کے لئے عظیم فتنہ بن جاتا ہے جب اس فلسفہ کے متعلق ذہن یہاں تک پہنچ جائے کہ قول و عمل کی یکسانیت کے سب سے بڑے علمبردار خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبّہ میں بھی (معاذ اللہ) اس امر کی علامت ہیں کہ حضورؐ نے دعوت کے زمانہ میں جو اصول پیش فرمائے تھے اقامتِ دین کے عملی زمانہ میں ان میں سے توحید و رسالت کے اساسی اصولوں کے علاوہ دوسرے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔

دین کو کھیل قرار دے کر اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کی یہ پہلی اور عظیم ہلاکت ہے جو اس جماعت کو بے اصولی اور طالع آزما سیاسی جماعت بنا کر رکھ دیتی ہے جس کا حقیقی سرمایہ ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس پر اعتماد رکھیں کہ وہ اقتدار کے حصول سے پہلے جو دعوے عوام سے کرتی ہے اور جو اصول اسلامی نظام کے وہ اپنی دعوت میں پیش کرتی ہے جب عمل کا زمانہ آئے گا اور جس وقت اس جماعت کو اقتدار حاصل ہو گا تو یہ ان اصولوں پر قائم رہے گی اور ہر قسم کی مزاحمتوں کے علی الرغم اپنے پیش کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہو گی۔"

(۲)

یہ ہے وہ "نظریہ ضرورت اور حکمتِ عملی" جسے اقامتِ دین کے مدعی (مودودی مرحوم) اسلام کہہ کر عام کرتے رہتے۔ خود بھی اس پر عمل پیرا رہے اور ان کی جماعت بھی۔ اس سے رفتہ رفتہ یہ جماعت کس مقام تک پہنچ گئی تھی اس کے متعلق اس جماعت کے ایک سابقہ ممتاز رکن سید وصی مظہر ندوی نے (جنہوں نے بقول ان کے اپنی زندگی کے بہترین تیس سال ان کے ساتھ گزارے تھے) اپنے ایک خط میں وضاحت کی ہے جو ماہنامہ میثاق کی محرم الحرام اور صفر ۱۴۰۳ھ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ وہ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"پھر کارکنوں کو بھی انتخابی ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی چلی گئی۔ ابتدا تو تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کی حیثیت سے ان کو ہر غلط طریقہ اختیار کرنے میں جھجک محسوس ہوئی لیکن آہستہ آہستہ "نظریہ ضرورت" و "نیت کی صحت" اور تحریک کے اندر اور باہر کے مخالفوں کو خاموش کر دینے کی غرض سے ایک دفعہ کامیاب ہو کر دکھا دینے کے جذبہ نے ہر غلط طریقہ کو جائز کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

پنجاب کے پہلے صوبائی انتخابات میں اصول پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص خود رضاکارانہ جعلی ووٹ ڈالنا چاہتا تو کارکن اس کو سختی کے ساتھ منع کرتے لیکن ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں جعلی ووٹ رہنماؤں کے علم میں ڈالے گئے، مگر انہوں نے اس قسم کی حرکتیں کرنے والوں کو نہ صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ کسی درجہ میں اُن کی طرف سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ پھر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نوبت اس حد تک جا پہنچی کہ ذمہ دار ارکان نے سیاہی مٹانے والے لوشن ایجاد کر کے ان کو استعمال کیا اور تحریک کے علم میں ہونے کے باوجود اُن لوگوں کا کوئی احتساب نہ کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں نعرے، تقریریں، الزامات، حرکات و سکنات غرض ہر پہلو سے تحریکِ اسلامی کے کارکن ماشاء اللہ ایک دنیا دار

سیاسی پارٹی کی سطح پر آچکے تھے بیگمات کے خلاف غیر مہذب نعرے، ہنگامہ خیز، بے پردہ خواتین کے جلوسوں کی قیادت، توڑ پھوڑ کی اسکیموں میں رہنمائی جلسوں اور جلوسوں کی ہماہمی میں نمازوں سے بے نیازی۔ غرض یہ کہ یہ سب کچھ جائز بلکہ مستحسن ٹھہرا دیا گیا۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے (خدانخواستہ) مقصود مودودی مرحوم یا ان کی جماعت کی تنقیص و تحقیر نہیں۔ اس سے مطلب یہ بتانا ہے کہ جب جھوٹ بولنے کو واجب قرار دیا جائے گا اور اصول شکنی کو (معاذ اللہ) سنت رسول اللہ تو اس سے اسی قسم کا کردار سامنے آئے گا۔ اس کے برعکس آپ تاریخ انسانیت پر ایک نظر ڈالیے اس میں وہی ہستیاں باعثِ افتخار اور وجۂ شرف نظر آئیں گی جنہوں نے جان دے دی لیکن جھوٹ کے ساتھ مفاہمت نہیں کی۔ خود صحابہ کبارؓ کی زندگی دیکھیے انہیں کس کس قسم کی رنج انگیز تکالیف پہنچائی گئیں، کیسی جانکاہ اذیتوں کا ہدف بنایا گیا۔ حتیٰ کہ بعض کو دردناک صعوبتوں کے بعد شہید تک کر دیا گیا۔ لیکن ان میں آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں انہوں نے جھوٹ بول کر (یا مداہنت اور منافقت سے حق کو چھپا کر) ان اذیتوں سے نجات یا موت سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہو۔ ان کے سامنے بھی تو قرآن کی وہ تعلیم تھی جس سے یہ حضرات جھوٹ بولنے کو واجب اور اصول شکنی کو مطابق سنت رسول اللہ ثابت کرتے ہیں۔ سنت رسول اللہ کیا تھی اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ جنگ بدر، صدر اوّل کی تاریخ میں نازک ترین مرحلہ تھا۔ میدان میں صفیں کھڑی ہو چکی تھیں کہ دو صحابہؓ حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور ابو حسیلؓ دوڑے دوڑے آئے اور صفوں میں شامل ہو گئے۔ ایسے موقع پر لشکر میں ایک مجاہد کا اضافہ بھی ہزار مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آ رہے تھے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ تم (حضرت) محمدؐ کی مدد کو جا رہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ مجاہدین سے آکر ملے ہیں۔ آپ نے سنا تو فرمایا کہ تم نے ان سے عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو۔ اللہ ہماری مدد کرے گا!! سوچیے کہ اس سے بڑھ کر "زندگی کی عملی ضرورت" اور کون سی ہوگی جس کے لئے (بقول ان حضرات کے) جھوٹ بولنا واجب ہوگا؟ حضورؐ نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ یہی ارشاد خداوندی تھا یہی تعلیم نبوی تھی۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کاروباری اور سیاسی دنیا میں جو کچھ جی میں آئے کیجئے لیکن (کم از کم) اسلام کے ضابطہ اخلاق کو تو کیا دین کی سطح پر نہ لائیے جس کی رُو سے ضرورت کے مطابق سب کچھ کر لینا جائز ہوتا ہے۔ (مودودی مرحوم کی پیش کردہ مثالوں میں) آپ جھوٹ بول کر میاں بیوی اور بہن بھائیوں میں صلح کرائیں گے تو چار ہی دن کے بعد اس جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی اور ان کی منافرت پہلے سے بھی زیادہ شدید ہو جائے گی۔ جہاں تک جنگ میں گرفتار ہو جانے والے سپاہی کا تعلق ہے تو (اگر مومن ہے تو) جان دے دے گا لیکن نہ جھوٹ بولے گا نہ اپنے لشکر کے راز افشا کرے گا۔ آپ قوم کے نوجوانوں کو صداقت پر کٹ مرنے کی تعلیم دیجئے جھوٹ اور فریب سے مطلب براری کا سبق نہ پڑھائیے۔ اس قسم کے نوجوان خود آپ کے لئے بھی وبالِ جان بن جائیں گے

اس کتاب کے تازہ ایڈیشن کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہی برہان دعویٰ) کہ اسلام نوعِ انسان کی جملہ مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور نکاح و طلاق کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل تو نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح، دل کش انداز اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں یکجا پیش کیا جائے —— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی پہلے بھی بڑی ضرورت تھی لیکن اب جبکہ اسلام، اسلام کا چرچا عام ہو رہا ہے لیکن کوئی نہیں بتاتا کہ اسلام ہے کیا، اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب (۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا لے اور (۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

اس کا تازہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ سفید کاغذ پر ادارہ طلوعِ اسلام کے روایتی معیار کے مطابق مضبوط، مجلد اور مطلا شائع کی گئی ہے۔ قیمت ۴۵ روپے۔ ڈاک پیکنگ ۵ روپے

چونکہ اس کے لئے تقاضوں کی کثرت ہے اس لئے کتاب کی ترسیل فرمائشوں کی ترتیب کے مطابق ہوگی۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵/بی، گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

سلسلہ

مطالب الفرقان

(قرآن کریم کی بصیرت افروز تفسیر)

پرویز صاحب کی زندگی کا مشن، قرآن کریم کا سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے

لغات القرآن مرتب کی جس میں مستند کتب لغت اور قرآنی آیات کی روشنی میں متعین کیا گیا کہ زمانہ نزول قرآن میں، ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھا جاتا تھا۔ اسی تحقیق کے دوران یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے

مفہوم القرآن مرتب کیا جو سارے قرآن کا نہایت حقیقت کشا مفہوم سامنے لے آتا ہے۔ پھر ان دونوں کی روشنی میں انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر کا سلسلہ شروع کیا جو اس اصول پہ مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔

مطالب الفرقان جلد اول۔ مشتمل بر سورۃ فاتحہ و سورۃ بقرہ آیات ۱ تا ۲۹

مطالب الفرقان جلد دوم۔ سورۃ بقرہ آیات ۳۰ تا ۱۱۲

مطالب الفرقان جلد سوم۔ سورۃ بقرہ آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ (اختتام)

مطالب الفرقان جلد چہارم۔ سورۃ آل عمران۔ النساء۔ اور مائدہ

مطالب الفرقان جلد پنجم۔ سورۃ الانعام (مکمل) و سورۃ اعراف آیات ۱ تا ۱۵۵

ان پانچوں جلدوں کے مضامین کے انڈکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔

تمام جلدیں اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر چھپی ہیں اور مضبوط دیدہ زیب جلدوں میں محفوظ ہیں۔ اس وقت ان کی قیمتیں (علاوہ محصول ڈاک) یہ ہیں: جلد اول ۶۰/- روپے۔ دوم ۷۵/-۔ سوم ۷۵/-۔ چہارم ۹۰/-۔ پنجم ۷۵/-

مکمل پانچ جلدیں ۳۷۵/- روپے

ملنے کا پتہ:-

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ (۲) مکتبہ دین و دانش - چوک اردو بازار، لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کرائے جاسکتے ہیں -

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 227/229 ALUMROCK ROAD B8 3BH,
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار پونے چھ بجے شام ۷ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1 بذریعہ V.C.R
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی صدر	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	بذریعہ V.C.R دار الشیرہ (بالائی منزل) بالمقابل سٹاپ بس نمبر ۲ ۔ سرمد روڈ
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر (OPP: VIP MAINGATE) پشاور کینٹ یارہ روڈ فون ۷۴۵۹ شریں محل 3-B یونیورسٹی ٹاؤن
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۷۶ یاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینیرنگ ورکس ۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۳ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب ۔ واقع K-1 234 کیہال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۴ ۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب -
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر قندھاری روڈ ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت ۔ گل روڈ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و بروز اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ ۱۲/بی بھمبر روڈ ۔ ۔ ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۱۰۷۱)
مجلس تحصیل کبیر والا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام ۔ مطب حکیم احمد دین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/۱۳۳ جیل روڈ کالونی ۱ (فون ۲۶۸۵۵۱)

کاتب کی ضرورت

ادارہ طلوع اسلام کے لیے ایک پختہ قلم۔ خوش نویس ہمہ وقتی کاتب کی ضرورت ہے جو نسخ اور نستعلیق میں یکساں قلمکار ہوں۔ معاوضہ حسب معیار اطمینان بخش دیا جائے گا۔ خواہشمند حضرات جمعۃ المبارک کا دن چھوڑ کر کسی بھی روز بارہ بجے سے چار بجے تک دفتر ادارہ طلوع اسلام۔ واقعہ ۲۵/بی گلبرگ ۲ بالمقابل گلبرگ پولیس اسٹیشن میں تشریف لائیں اور اپنا قلم ساتھ لائیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

لفافہ بند کرتے وقت

اس کا خیال رکھیے کہ اسے کھولا بھی جائے گا۔ بیشتر لفافے ایسے موصول ہوتے ہیں جن کا چٹھی کا کاغذ لفافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے کھولنے میں دقت بھی ہوتی ہے اور وہ اکثر و بیشتر پھٹ بھی جاتا ہے اس کا خاص طور پہ خیال رکھیے۔

ناظم ادارہ

کراچی کے قارئین

کے لیے مژدہ